روشنی تو ہونے دو

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

ڈاکٹر سخاوت

روشنی تو ہونے دو

KUTUB KHANA.
JALALI BOOKS
JALALI

سخاوت شمیم

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب ـــــــــ روشنی تو ہونے دو
شاعر ـــــــــ ڈاکٹر سخاوت شمیم
ناشر ـــــــــ ڈاکٹر سخاوت شمیم
سنہ اشاعت ـــــــــ ۱۹۹۹ء
تعداد ـــــــــ چار سو
قیمت ـــــــــ ایک سو روپے
کاتب ـــــــــ خورشید احمد۔ جے پور
سرورق ـــــــــ جمیل احمد
مطبع ـــــــــ گلاب آفسیٹ پریس لکھنؤ

ملنے کے پتے :

ڈاکٹر سخاوت شمیم ڈی۔ بی اسپتال چورو
مکتبہ جامعہ اردو بازار دھلی
مسکین بکڈپو موتی ڈونگری روڈ جے پور
موڈرن پبلشنگ ہاؤس جامع مسجد دہلی

JALALI BOOKS KUTUB KHANA JALALI

اپنے والد مرحوم

مرزا مبارک علی بیگ دلؔ ایوبی

کے نام

سخاوت شمیم

KUTUBKHANA
JALALI BOOKS
JALALI

یہ کتاب

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی

حکومت اتر پردیش

کے

تعاون سے شائع ہوئی ہے

KUTUB KHANA JALALI BOOKS

فہرست

پیش لفظ	شمس الرحمٰن فاروقی	۱۱
وجہ شاعری		۱۳
غزلیں		۱۷
اک لفظ کن سے خلق سبھی ہو گئے حروف		۱۹
حقیقت جان لینا چاہتا ہوں		۲۰
یاد تیری کسی خوشی کی طرح		۲۱
حرف تہجی سیکھ رہا ہوں		۲۲
راہ میں کوئی کھڑا ہو جیسے		۲۳
گو ترے شہر میں سبھی رات رہے		۲۴
طواف کوچہ جاناں کی بات کرتے رہو		۲۵
خامیٔ ظرف کا آزار ہے جس کو دیکھو		۲۶
زندگی کی راہوں میں پُر خطر اندھیرا ہے		۲۷
روشنی دل میں نہ آنکھوں میں چمک ہو جیسے		۲۸
نگہِ حسن تو تجدید وفا مانگے ہے		۲۹
امنِ ہستی طلب گار کہاں آ پہنچے		۳۰
میری خاموش محبت کا پتہ ہی کب ہے		۳۱
لذتِ درد ہے انعامِ محبّت یارو		۳۲
ذہن میں میرے بسی ہے ترے در کی خوشبو		۳۳
ہم نے بنا لیا جو مکاں تیرے شہر میں		۳۴

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

اس نے کچھ کہنے سے پہلے یہ نہ سوچا ہوگا	۳۵
اپنے سائے کی حدوں سے بھی نکلتا جاؤں	۳۶
پرسکون ذہنوں میں کرب آگہی رکھ دو	۳۷
راتوں کا کیف شہر کی گلیوں پہ چھا گیا	۳۸
قافلہ زیست کا ہر چند کہ ٹھہرا ہی نہیں	۳۹
روشنی در پہ کھڑی مجھ کو بلاتی کیوں ہے	۴۰
امڈتی بھیڑ کا ہر آدمی نرالا ہے	۴۱
خموشیوں سے کئی بار کی ہے میں نے بات	۴۲
سکوت شب کو جو الزام کی تلاش ہوئی	۴۳
لوگ پابندِ سُبک گامیٔ رفتار نہ تھے	۴۴
لبوں پہ سرخ لکیروں کا جال جیسا تھا	۴۵
لوگ ہیں وقت کی بیباک اڑانوں جیسے	۴۶
شکست خواب کا خاموش ترجماں جیسا	۴۷
دن کو ڈھکیل آیا صعوبت کے غار میں	۴۸
ہمارے دیدۂ دل پر عیاں بہت کچھ ہے	۴۹
اس شہر میں تو عام یہ دستور ہوگیا	۵۰
تنہائیوں کی بھیڑ سی اک دل کے پاس ہے	۵۱
وہ ایک شخص جو اپنا دکھائی دیتا ہے	۵۲
جاگتے لمحوں سے جب اپنا بدن چمکائے گی	۵۳
بدلتے موسموں کی بات ہوگی	۵۴
جان و دل پر بار تھا جس کے لہو کا سلسلہ	۵۵

سلگتی شمع دھواں دے رہی ہے آوارہ ۵۶
رگ و پے کی شہزادگی ہے سمندر ۵۷
اپنی ہستی کا آئینہ مجھ میں ۵۸
پل بھر میں پگھلتے ہوئے لمحے کی طرح ہے ۵۹
نبھانے دل کو تمنا کا کچھ صلہ بھی ملا ۶۰
خوش فہمیوں کا ذہن میں فقدان کر گیا ۶۱
واقف رہے کہ اجنبی اپنے بدن سے ہم ۶۲
آنسوؤں کا حساب مت رکھنا ۶۳
وہی ہے اب جو ترا انتظار پہلے تھا ۶۴
پرندوں کو شجر اپنا لگے ہے ۶۵
آئینہ خانے کے باہر ہم ہیں ۶۶
جس کی اپنے سے پہل ہو وہ سفر کیسا ۶۷
یہ زمیں آسمان خالی ہے ۶۸
آئینہ بن کے مرے سامنے رہنے والا ۶۹
یہ جو نادانیاں ہماری ہیں ۷۰
اپنے بدن کی آنچ میں تپ کر لگا مجھے ۷۱
زرد پتے سب اڑا لے جائے گی ۷۲
دنیا کی انگوٹھی میں نگینہ سا لگے ہے ۷۳
ہم نے جو کسی خواب کو تعبیر کیا ہے ۷۴

میڈیکل نظمیں

پلاسٹک سرجری ۷۷

خونِ کا سودا	۷۹
روحِ رواں	۸۲
فنگر پرنٹس	۸۳
دردِ دل	۸۵
آنکھ کا جالا	۸۷
حسنِ بیمار	۸۸
نغمہ ہائے وطن	۹۱
وفا کی راہ	۹۳
خیر مقدم	۹۴
وطن کے نام یہ....	۹۶
ہم	۹۸
سلامت روی کا دور	۱۰۰
نظمیں	۱۰۱
پیش گوئی	۱۰۳
امنگ	۱۰۴
نام	۱۰۵
تلاش	۱۰۶
بے وفا	۱۰۷
شامِ ملاقات	۱۰۹
انتشار	۱۱۰
پیکرِ خیال	۱۱۱
سرابوں کا سفر	۱۱۲

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

اکائی	۱۱۴
روشنی تو ہونے دو	۱۱۵
نارسائی	۱۱۶
تم	۱۱۷
تجدید	۱۱۸
سراب	۱۱۹
پٹراؤ	۱۲۰
قانون کی موت	۱۲۱
ٹائم مشین	۱۲۲
قطعات	۱۲۳

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

ڈاکٹر سخاوت شمیم

نام: سخاوت علی بیگ

تاریخِ پیدائش: ۸ر جون ۱۹۵۱ء

جائے پیدائش: ٹونک (راجستھان)

ولدیت: جناب مبارک علی بیگ دآل ایوبی

تعلیم: ایم۔بی۔بی۔ایس ۱۹۷۳ء

ایم۔ایس (جنرل سرجری) ۱۹۷۸ء

محلِ کار: سرجن ڈی۔بی اسپتال

چورو (راجستھان)

رابطہ: A/30، امرت پوری نگھاٹ گیٹ

جے پور۔ 302003

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS

پیش لفظ

سخاوت شمیم اردو شعرا کے اس مختصر سے گروہ کے رکن ہیں جو ڈاکٹری، وکالت، انجینری وغیرہ جیسے غیر شاعرانہ پیشوں سے منسلک ہیں۔ اردو میں یہ روایت پرانی ہے کہ صاحبِ ذوق اور شعر فہم لوگ، چاہے وہ کسی پیشے یا طبقے سے تعلق رکھتے ہوں، شعر گوئی یا کسی بھی تخلیقی کارگزاری کو اپنے وظیفۂ زندگی کا حصہ سمجھتے ہیں اور اپنی داخلی واردات کو شعر و ادب کے ذریعہ بیان کرتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں ڈاکٹر عزیز تمنائی مدراس میں ایک طویل عرصہ سے سرگرم سخن ہیں۔ ان سے کچھ ہی کم عرصے سے ڈاکٹر ظفر حمیدی مظفر پور میں شعر و سخن اور انسانوں کی نباضی میں یکساں مشہور و معروف ہیں۔ ڈاکٹر سخاوت شمیم کو ایک اختصاص یہ حاصل ہے کہ انھوں نے خالص طبّی موضوعات (مثلاً عطیۂ خون، پلاسٹک سرجری اور دورانِ خون) پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ اگرچہ ان نظموں میں ابھی وہ پختگی اور مقامی سروکارات سے بلند ہو کر غیر شخصی اور نسبتاً وسیع تر تناظر فکر و احساس میں روشنی بار ہونے کی خصوصیت نہیں ہوئی ہے، لیکن تازہ موضوعات، اور خاص کر (بظاہر) غیر شاعرانہ موضوعات پر شعر کہنا، آسان نہیں۔ ان نظموں کو آئندہ کے لیے نشانِ راہ کہہ سکتے ہیں۔

طبّی موضوعات سے ہٹ کر بھی سخاوت شمیم نے کئی مضامین اپنائے ہیں۔ ان کی نظمیں جن میں شاعر/متکلم کائناتی اور خارجی حقیقت کے سامنے خود کو ایک

بے بس طالب علم یا جویائے حقیقت کے روپ میں دیکھتا ہے، ہمارے زمانے کی واقعیت کا عمدہ نمونہ ہیں۔

سخاوت شمیم کی غزلوں میں روایت، قبولیتِ عام اور ذاتی غور و فکر کی کشاکش نظر آتی ہے۔ یقین ہے کہ وہ آئندہ اور بھی کئی منازل طے کریں گے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

الٰہ باد

۲۸ر جون ۱۹۹۶ء

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

وجہِ شاعری

افریقہ کے گھنے جنگلوں کی ایک بستی میں ہر شام کو ایک معالج سرجن کئی مریضوں کے آپریشن کرتا اور بیشتر شفایاب ہوتے۔ خبر مہذب دنیا تک پہنچی تو امریکا سے ایک وفد جدید آلجات سے لیس ہو کر وہاں گیا۔ ایکسرے و مزید جانچوں سے تشخیص کے بعد کچھ مریضوں کو علاج کے لیے پیش کیا اور اس سرجن نے ہر بیماری کا آپریشن کر ڈالا۔ تحقیقاتی مشن نے ایک بات نوٹ کی کہ یہ علاج کا سلسلہ صرف شام کو رہتا تھا اور ان اوقات میں وہ قبائلی معالج اپنی زبان نہ بول کر شستہ جرمنی بولتا تھا اور اپنا نام بھی کچھ اور بتاتا تھا۔ جب اُس نام کے ڈاکٹر کی تلاش جرمنی کی تاریخِ طب میں کی گئی تو پتہ چلا کہ اس نام کا سرجن سالوں پہلے ہوا تھا' وہ جس مریض کا آپریشن کرتا وہ مر جاتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی زندگی میڈیکل پروفیشن کو وقف کرتے ہوئے خودکشی کر لی تھی۔ شاید یہ اس کی روح تھی جو خلاؤں میں رہ کر بھی بے چین رہی اور طبی کمالات لیے دوسروں میں منتقل ہو کر تسکین حاصل کرتی رہی۔ کشاکشِ حیات کے محشرستان سے نجات پا کر فکرِ شعر میں ڈوب جانا ایسا ہی تسکین بخش ہوتا ہے۔

ابہام کے دھندلکوں میں پناہ لینا' نئے لب و لہجہ کے نام پر راہ رووں سے خالی سنسان سڑک پر چلتے رہنا اور دور از قیاس تجرباتِ فکر کا سہارا لے کر اپنی شاعری کو عجوبہ نہ بتاتے ہوئے میں نے مروجہ اسلوبِ شعر میں انسانی جذبات کی فطری عکاسی اور درونِ ذات کے کرب و نشاط کو اُجاگر کیا ہے۔ میں نے اپنی میڈیکل لائف کے تجربات کو بھی نظم کرنے کی کوشش ہے۔ "پلاسٹک سرجری"، "فنگر پرنٹس"، "خون کا سودا" اور "آنکھ کا جالا" اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔

کچھ رسائل اور کچھ مقتدر ادبی شخصیات نے انہیں سراہا جیسے ..

"ایسی نظمیں اردو ادب میں اضافہ ہیں". (نیا دور لکھنؤ ۱۹۷۱ء)

"تازہ موضوعات اور (بظاہر) غیر شاعرانہ موضوعات پر شعر کہنا آسان نہیں ان نظموں کو آئندہ کے لئے نشانِ راہ کہہ سکتے۔" (شمس الرحمٰن فاروقی)

اچھا شعر کہنے کے بعد میرے اندر رقص کی کیفیت پیدا ہوئی اور کیوں لکھنے کا مفہوم سمجھ میں آیا۔ مثنوی مولانا رومؒ میں ایک "حکایتِ مجنوں" آتی ہے جس میں ایک صحرا نورد نے مجنوں کو تنہا بیٹھے اور انگلیوں کے قلم سے ریت پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھا۔ صحرا نورد نے مجنوں سے پوچھا کہ یہ خط کس کے نام لکھ رہے ہو۔ یہ تو ریت پر سے مٹ جائے گا مجنوں۔ گفت شرح حسنِ لیلیٰ می دہم

خاطرِ خود را تسلّی می دہم

یہی وجہِ شاعری بھی ہے۔

ہوش سنبھالا تو ادبی ماحول ملا۔ میرے والدِ محترم جناب دل ایوبی راجستھان کے بہترین شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ تربیت کا سلسلہ دینی تعلیم اور اردو سے شروع ہوا۔ پھر وقت کے تقاضوں پر چل پڑا۔ ۱۹۷۳ء میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس اور ۱۹۷۸ء میں ایم۔ ایس جنرل سرجری کی ڈگری لی اور تبھی سے راجستھان سرکار میں سرجن کی حیثیت سے ملازمت میں ہوں۔ ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۹ء تک ڈپوٹیشن پر ایران کے شہر ہمدان میں رہا جہاں بوعلی سینا اور بابا طاہر کے مقامات ہیں۔

شاعری کی شروعات سیکنڈری اسکول کے زمانۂ طالب علمی یعنی ۱۹۶۵ء سے ہوئی۔ استادِ محترم صاحبزادہ عبدالمنعم خاں صاحب نے انگریزی پڑھانے کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق کو بھی جِلا بخشی۔ شاعری پر اصلاح والد محترم جناب دل ایوبی صاحب سے لی۔ میرا کلام سب سے پہلے "آجکل" نئی دہلی (اکتوبر ۱۹۶۹ء) میں شایع ہوا پھر ایسے ہی نامور جرائد و رسائل میں نظمیں و غزلیں اشاعت پذیر ہوتی رہیں۔

میں ممنوں ہوں جناب انعام الحق صاحب (سابق چیرمین راجستھان اردو اکادمی جے پور اور موجودہ صدر "انجمن ترقی اردو (ہند) راجستھان") کا جنھوں نے حوصلہ افزائی فرمائی۔ جناب قائد علی خاں اور مرزا لیاقت بیگ کے مستقل تقاضوں کی تکمیل کی شکل میں یہ مجموعہ انتہائی عجلت میں ترتیب دیا ہے

اس تمنا کے ساتھ، ارباب علم و دانش کی خدمت میں یہ مجموعہ پیش ہے کہ ؎

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

آخر میں ڈاکٹر ای۔ اے حیدری لکچرر شعبہ اردو گورنمنٹ لوہیا کالج چورو کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ کتابت پروف اور طباعت کے مرحلے کی ذمہ داری انہوں نے اپنے سر لے کر مجھے سبکدوش کر دیا۔

۲۶ دسمبر ۹۸ء

سخاوت شمیم
سرجن ڈی۔ بی۔ اسپتال
چورو۔ راجستھان

JALALI BOOKS
JALALI

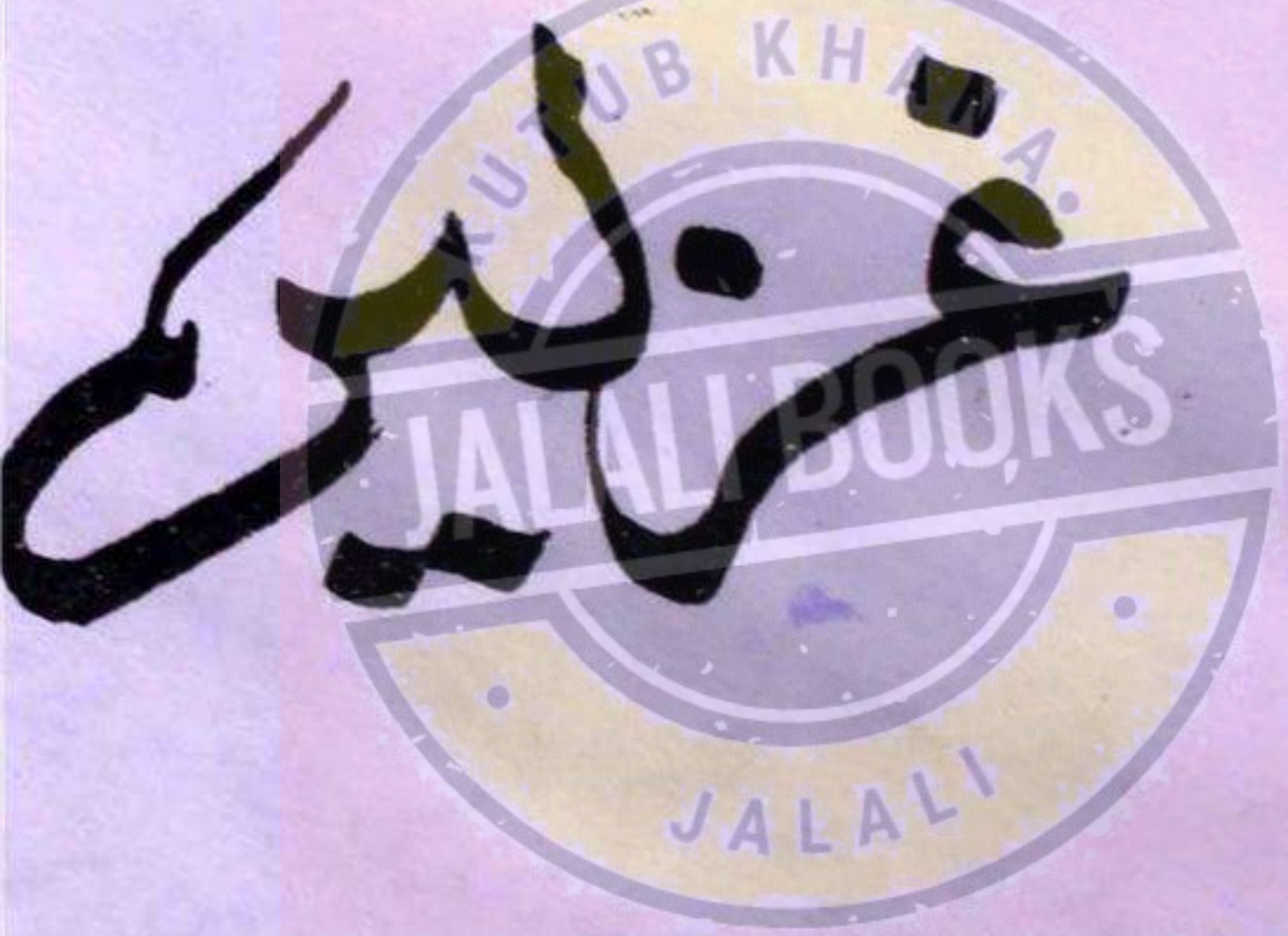
KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

○

اک لفظ کُن سے خلق سبھی ہو گئے حروف
ہیں جانِ کائنات مگر ان کہے حروف

یہ انتشارِ ذات کا عالم ہے ان دنوں
جیسے بکھر گئے ہوں مرے نام کے حروف

اعلان کر رہے ہیں کہ ہم کو نہ بھولئے
دیوار و در پہ جا بہ جا لکھے ہوئے حروف

میری طلب سے لفظِ وفا کو ثبات ہے
میں دور جب ہوا تو بلاتے رہے حروف

ہونٹوں سے لکھ رہا تھا کوئی بات جسم پر
زلفوں کے سائے میں بھی جلے اَدھ جلے حروف

یہ کرب کائنات کا جن میں سما سکے
ترتیب دیجئے کچھ ایسے نئے حروف

وہ محوِ انتظار مجھے شوقِ باز گشت
ہونٹوں پہ آ کے جانے کہاں کھو گئے حروف

لکھنے کو اہتمام سے اک نام اے نسیمؔ
دن رات ڈھونڈتا ہوں مہکتے ہوئے حروف

حقیقت جان لینا چاہتا ہوں
تجھے پہچان لینا چاہتا ہوں

مجھے اِدراک اپنا ہو گیا ہے
تجھے اب مان لینا چاہتا ہوں

مصائب دھوپ، سایہ تری یادیں
یہ چادر تان لینا چاہتا ہوں

دو عالم جب مرے اپنے تھے مولا
وہی اوسان لینا چاہتا ہوں

مرے اندر ہی اب جینے لگا ہے
میں جس کی جان لینا چاہتا ہوں

شمیم آسان ہوگا بھول جانا
خلش انجان لینا چاہتا ہوں

●●

یاد تیری کسی خوشی کی طرح
مجھ سے ملتی ہے اجنبی کی طرح

ہے اندھیرا مرا اکیلا پن
تم چلے آؤ روشنی کی طرح

یہ ازل سے اَبد کی دوری بھی
سلسلہ ہے تری گلی کی طرح

دشمنی میں نہ تھا کوئی خطرہ
اب تعلق ہے دوستی کی طرح

فطرت عشق میں ہے جولانی
ان کے جلووں کی تازگی کی طرح

ہائے شامِ فراق کا عالم
ہر نفس ہے کسی صدی کی طرح

موت کا یوں تو ڈر نہیں، لیکن
ہو کہیں وہ بھی زندگی کی طرح

دل پہ گزری ہے کیا شمیم نہ پوچھ
جب ملا ہے کوئی کسی کی طرح

●●

حرفِ تہجی سیکھ رہا ہوں
دریا میں میں کود گیا ہوں

سامنے منزل آگئی، لیکن
آگے کیا ہے سوچ رہا ہوں

تیری طرف اک گام بڑھا تھا
اب میں خود کو ڈھونڈ رہا ہوں

منزل سے ہے اتنا تعلق
میل کا پتھر بن کے کھڑا ہوں

میرے قدم کی آہٹ پاکر
رات جو سہمی، چونک گیا ہوں

کون کرے گا زحمت صیقل
زنگ لگا اک آئینہ ہوں

●●

راہ میں کوئی کھڑا ہو جیسے
اس کو منزل کا پتہ ہو جیسے

کیا ہوئے آج وہ چہرے کے نقوش
آئینہ پوچھ رہا ہو جیسے

میرے ہمراہ نہیں تو جب سے
یہ سفر ایک سزا ہو جیسے

تیری یادوں سے گریزاں ہونا
اب غمِ دل کی دوا ہو جیسے

ہر نفس یوں ہے ضرورت تیری
تو کبھی ساتھ رہا ہو جیسے

فکرِ تعبیر میں سرگرداں ہوں
خواب اک دیکھ لیا ہو جیسے

سارا عالم متلاشی اور وہ
میرے اندر ہی چھپا ہو جیسے

اُف یہ خاموش محبت کہ شمیمؔ
سارے عالم کو پتہ ہو جیسے

●●

○

گو ترے شہر میں بھی رات رہے
صبح تک تشنۂ حیات رہے

درد کا چاند بجھ گیا، لیکن
غم کے تارے تمام رات رہے

تلخیٔ زیست گر مقدّر ہو
کیوں کوئی محوِ التفات رہے

اور بھی ہیں تعلّقات، مگر
غم کے رشتے سے میری بات رہے

زندگی میں اجل سے پہلے ہی
کیسے جانکاہ سانحات رہے

ہم کو ان سے شکایتیں ہیں شمیمؔ
لوگ مرہونِ التفات رہے

●●

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

○

طوافِ کوچۂ جاناں کی بات کرتے رہو
سرور و مستیٔ و ارماں کی بات کرتے رہو

نگاہِ حسنِ مجسم نواز دے شاید
مقامِ رفعتِ انساں کی بات کرتے رہو

اندھیرے چار سو چھائے ہوئے تو ہیں لیکن
نمودِ صبحِ درخشاں کی بات کرتے رہو

یہ اور بات کہ بڑھ جائیں دوریاں لیکن
حصولِ قرب کے امکاں کی بات کرتے رہو

سزائے جرأتِ اظہار دار ہے لیکن
رموزِ صنعتِ یزداں کی بات کرتے رہو

ادائے ناز کی باتیں گناہ ہیں، لیکن
شمیمؔ غارتِ ایماں کی بات کرتے رہو

●●

○

خامیٔ ظرف کا آزار ہے جس کو دیکھو
پھر بھی مستِ مئے پندار ہے جس کو دیکھو

قابلِ دید نہیں چشمِ تمنّا، لیکن
اک غمِ حسرتِ دیدار ہے جس کو دیکھو

اب تری بزم میں ہوگا کسے اعزاز نصیب
سرفروشی کو بھی تیار ہے جس کو دیکھو

خالقِ حسن کا شہکار نہیں ہے، نہ سہی
اپنی نظروں میں تو شہکار ہے جس کو دیکھو

جس کی نظروں میں نہیں کوئی وفا کی قیمت
اس جفا جو کا خریدار ہے جس کو دیکھو

یہ تمنّا ہے کہ سب لوگ اُسے بھول کہیں
اور خود چُبھتا ہوا خار ہے جس کو دیکھو

کون پروازِ تخیّل پہ کرے ناز شمیمؔ
اپنے زنداں میں گرفتار ہے جس کو دیکھو

●●

زندگی کی راہوں میں پُرخطر اندھیرا ہے
دیکھ کر قدم رکھنا ہمسفر اندھیرا ہے

غم کی رات میں یوں تو زخمِ دل بھی روشن ہیں
پھر بھی دیکھ لے آکر، کس قدر اندھیرا ہے

تابناک ماضی کے اُن حسین محلوں کا
ہر چراغ مُردہ ہے، ہر کھنڈر اندھیرا ہے

عزم کے چراغوں کی لَو ذرا بڑھا لینا
دور تک یہاں سے اب ہمسفر اندھیرا ہے

روشنی کا پرتو تھی تیری دید کی اُمّید
خیر ہو نگاہوں کی بام پر اندھیرا ہے

عارضوں کی صبحوں پر شام بن کے چھا جائے
زلف جس کو کہتے ہیں سر بسر اندھیرا ہے

اک فقیر کی آنکھیں پھوڑ دی تھیں لوگوں نے
اے شمیمؔ اُس دن سے در بدر اندھیرا ہے

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS

○

روشنی دل میں نہ آنکھوں میں چمک ہو جیسے
اب تو ایمان ہی سکّوں کی کھنک ہو جیسے

زلفِ شب رنگ کے سائے میں ہے رنگیں آنچل
دور بادل کے تلے ایک دھنک ہو جیسے

یوں مجھے دیکھ کر آتا ہے تغیّر رُخ پر
اس کے کانوں میں کوئی اڑتی بھنک ہو جیسے

پردۂ ذہن پہ یوں ہے لب لعلیں کا خیال
میرے احساس پہ شعلوں کی لپک ہو جیسے

ایک انگڑائی سے آجاتی ہے گلشن میں بہار
شاخِ گل میں تری باہوں کی لچک ہو جیسے

ہر دنیا یہ نمائش کے سوا کچھ بھی نہیں
زیست پیراہنِ رنگیں کی بھڑک ہو جیسے

ہر گلی قتل گہِ اہلِ وفا ہے جب سے
شہر میں اس کے ہی کوچہ کی مہک ہو جیسے

اس نے دیکھا ہے مری سمت کچھ اسطرح شمیمؔ
میرے اظہارِ محبت پہ بھی شک ہو جیسے

●●

○

نگہِ حُسن تو تجدیدِ وفا مانگے ہے
شدّتِ شوق سے پوچھو کہ وہ کیا مانگے ہے

سنِ بیداد تو دیکھو اُسے کیا ہے منظور
سر تو مانگے ہے مگر تن سے جدا مانگے ہے

ہوئے مقتل جو بصد شوق بڑھا جاتا ہوں
پھر کوئی دستِ ستم رنگِ حِنا مانگے ہے

تیرا چہرہ ہے نئے دور کا روشن مرکز
جس سے خورشید بھی ہر صبح ضیا مانگے ہے

یادِ محبوب کی مرنے نہیں دیتی ورنہ
کون اِس دور میں جینے کی دعا مانگے ہے

عقل گم کردۂ احساس خودی ہے کہ جو بھی
اے خوشا ذوق جنوں بڑھ کے سزا مانگے ہے

خود بخود رُکنے لگے ہیں جو قدم آج شمیمؔ
کوئی منزل مرے رکنے کی دعا مانگے ہے

●●

امن، ہستی کے طلبگار کہاں آ پہنچے
گھر سے چل کر یہ سرِ دار کہاں آ پہنچے

سانس لینا ہے تمنائے سحر میں مشکل
شامِ فرقت ترے بیمار کہاں آ پہنچے

وہ جو وابستۂ آدابِ غلامی تھے کبھی
دیکھ اے وقت کی رفتار کہاں آ پہنچے

موت کا حملۂ بے باک بھی ناکام رہا
سہہ کے ہم زیست کا آزار کہاں آ پہنچے

شدّتِ شوق ہے تپتے ہوئے صحرا کی طرح
اس میں ہم جیسے وفادار کہاں آ پہنچے

عرضِ مطلب کے جواں سال ارادے لیکر
جنبشِ لب کے گنہگار کہاں آ پہنچے

یہ تو پرچھائیں ہے اٹھتے ہوئے شعلوں کی شمیمؔ
دیکھ کر سایۂ دیوار کہاں آ پہنچے

●●

○

میری خاموش محبت کا پتہ ہی کب ہے
اس کے چہرے پہ کوئی رنگ رہا ہی کب ہے

حرف پہلا مرے ہونٹوں پہ چلا آیا تھا
میری محبوب ترا نام لیا ہی کب ہے

حسن کی رفعتِ بیحد کا پتہ دیتی ہے
اس کی انگڑائی فقط ایک ادا ہی کب ہے

اس کی نظریں ہیں بہاروں کی نگہباں، لیکن
دل کے صحرا میں کوئی پھول کھلا ہی کب ہے

تیری یادوں نے اکیلا مجھے چھوڑا کس دن
مجھ کو تنہائی کا احساس ہوا ہی کب ہے

صبحِ امید کی کرنوں نے پیامی بن کر
شب کے ماروں کا کبھی ساتھ دیا ہی کب ہے

زیست کو رکھتے ہیں ٹھوکر میں ہمیشہ جو شمیمؔ
ان جیالوں کے لیے دار سزا ہی کب ہے

●●

○

لذّت درد ہے انعامِ محبّت یارو
اور تغافل نگہِ شوق کی قیمت یارو

گاہے گاہے وہ مجھے دیکھ لیا کرتے ہیں
اُن سے اتنا بھی تعلق ہے غنیمت یارو

اپنے اوصاف کی ہر آن حفاظت کے سوا
اور کیا مانگے ہے کردار کی عظمت یارو

ہو تصور میں اگر حسن تصوّر کی جھلک
فاصلے بھی نظر آنے لگیں قربت یارو

میں نے کیا مانگ لیا مہر و محبت کے سوا
کیوں اڑی جاتی ہے یہ چہروں کی رنگت یارو

درد ہی اپنا مداوا ہے اگر یہ سچ ہے
کیوں فزوں تر ہے مرے درد کی شدت یارو

بچ دیتے ہیں یہاں فرض کا احساس بھی لوگ
آج ہر شے پہ مقدم ہے ضرورت یارو

شکوہ سنجِ غمِ تقدیر بھی کیوں ہوتا تمیم
آدمی خود ہی بنا سکتا جو قسمت یارو

ذہن میں میرے بسی ہے ترے در کی خوشبو
یا صبا لاتی ہے ہر روز اُدھر کی خوشبو

اس قدر گردشِ دوراں نے دیے ہیں چکّر
اپنے کمرے سے بھی آتی ہے سفر کی خوشبو

دوستی کے لیے، ہم ہاتھ بڑھائیں لیکن
کسی ہم عمر سے آئے تو بشر کی خوشبو

جب سے یادوں کی گزرگاہ کا اعزاز ملا
دل سے آتی ہے تری راہگزر کی خوشبو

وحشتیں دشت میں یوں میری بڑھی جاتی ہیں
جیسے آتی ہو ہر اک سمت سے گھر کی خوشبو

کیا کوئی تیر نظر جسم کے اُس پار ہوا؟
کیوں شمیمؔ آنے لگی خونِ جگر کی خوشبو

●●

○

ہم نے بنالیا جو مکاں تیرے شہر میں
ذرّوں کو مل گئی ہے زباں تیرے شہر میں

ٹھہرے ہوئے ہوں جیسے بہاروں کے قافلے
اک سیلِ رنگ و بو ہے رواں تیرے شہر میں

پہچانتے تھے لوگ تجھے جس کے نام سے
اب وہ بھی اجنبی ہے میاں تیرے شہر میں

محسوس ہو رہا ہے کہ ہم وہ نہیں رہے
کتنا بدل گیا ہے سماں تیرے شہر میں

مُنصف بھی ہیں، گواہ بھی، قاتل بھی بے بدل
فریاد لے کے جائیں کہاں تیرے شہر میں

اک دشتِ بے اماں ہے تمنا کا سلسلہ
اک راز بن گئی ہے فغاں تیرے شہر میں

شاید فصیلِ شہر ہو بے آبرو سلیمؔ
ہوتا ہے ذکرِ امن و اماں تیرے شہر میں

●●

○

اس نے کچھ کہنے سے پہلے یہ نہ سوچا ہوگا
میرے احساس سے اس کا کوئی رشتہ ہوگا

منتظر شام کے لمحوں میں سمائی ہے حیات
اب نہ رات آئے گی کوئی نہ سویرا ہوگا

یوں تو کچھ لوگ چلے آئیں گے چیخیں سُنکر
کون مجروح صداؤں کا مسیحا ہوگا

ملنے والوں کو کتابوں کا گماں گزرا ہے
آپ کی ذات پہ الفاظ کا پہرہ ہوگا

کوئی عیسیٰ ہے نہ منصور نہ کوئی سقراط
جنبشِ لب ہے کوئی معجزہ اب کیا ہوگا

گم نہ کر دے کہیں ہنگامۂ ہستی اس کو
گھر سے ہر شخص یہی سوچ کے چلتا ہوگا

ہم اگر مر بھی گئے لوگ نہ مانیں گے شمیمؔ
تم اگر جیتے رہو گے تو بھلا کیا ہوگا

●●

○

اپنے سائے کی حدوں سے بھی نکلتا جاؤں
شام سے پہلے سحر بن کے ابھرتا جاؤں

تھک گیا ہوں کسی سمٹے ہوئے پتھر کی طرح
ایسی ٹھوکر کوئی مارے کہ بکھرتا جاؤں

چھین لے مجھ سے اگر کوئی مری شعلہ صفت
موم کی طرح ترے ساتھ پگھلتا جاؤں

تیرے ہونٹوں کے تبسم کی فصیلوں سے پرے
قہقہہ بن کے رگ و پے میں مچلتا جاؤں

آسمانوں سے صدا کوئی نہ آئے جب تک
میں خلاؤں کی طرف بڑھتا ہی بڑھتا جاؤں

انگلیاں میری رگِ گل پہ اگر بار نہ ہوں
تیرے ہاتھوں کی لکیروں سے بہلتا جاؤں

دور سے آیا ہوں اور دور ہی جانا ہے مجھے
سوچتا ہوں کہ ترے پاس ٹھہرتا جاؤں

جب، ہو سانسوں کا تسلسل بھی گراں بارِ شمیم
ایسی صورت کوئی نکلے کہ سمٹتا جاؤں

●●

پرسکون ذہنوں میں کربِ آگہی رکھ دو
مُضمحل سے چہروں پر عزمِ زندگی رکھ دو

بے شمار لوگوں کو ہم خیال کرنا ہے
آج میرے ہونٹوں پر مہرِ خامشی رکھ دو

پُر اُمید چہروں پہ آرزو مچلتی ہے
پھول جب بھی کمہلائے سیج پر کلی رکھ دو

سانس لینا دوبھر ہے آج نسلِ آدم کو
دورِ نو کے کاندھوں پر آخری صدی رکھ دو

لمس اپنے ہونٹوں کا یا شراب کی بوندیں
زلف کے اندھیروں میں کچھ تو روشنی رکھ دو

اے شمیمؔ خوابوں کو زندگی سے کیا نسبت
ذہن کے جھروکوں پر دست آہنی رکھ دو

●●

○

راتوں کا کیف شہر کی گلیوں پہ چھا گیا
بستر کو کون چھوڑ کے سڑکوں پہ آ گیا

تم نے کبھی لکھے تھے مرے نام جو خطوط
شیرازہ میری ذات کا ان میں سما گیا

آہٹ پہ چونکتے ہوئے صدیاں گزر گئیں
ہر پل یہ یہ گمان ہوا تو ہی آ گیا

اک دن ضرور نور برستا ہے حُسن پر
میں کیا بتاؤں مجھ کو وہ کس روز بھا گیا

بے رنگ فاصلوں کی مسافت کو جھیل کر
بڑھتا ہوا جلوس شفق بن کے چھا گیا

تیرے بدن کی آنچ ہے یا دوپہر کی دھوپ
زلفوں کے سائے کو بھی پسینہ سا آ گیا

کیا نیند میں میں چونک پڑا تھا کہ دوڑ کر
گھر کا ہر ایک فرد مرے پاس آ گیا

کچھ دور میرے ساتھ رہی زندگی شمیم
پھر مجھ میں کائنات کا نقشہ سما گیا

●●

قافلہ زیست کا ہر چند کہ ٹھہرا ہی نہیں
آج تک منزل مقصود پہ پہنچا ہی نہیں

اجنبی سی نظر آتی ہیں نگاہیں اس کی
جیسے اس نے مری جانب کبھی دیکھا ہی نہیں

دھوپ جب تیز نہ تھی سایۂ دیوار بھی تھا
دوپہر آئی تو سر پر کوئی سایہ ہی نہیں

دل کی گمنام امنگوں کی پزیرائی کو
اجنبی رات کا دامن ابھی پھیلا ہی نہیں

ذہن میں غم کی گھٹن اور بڑھی جاتی ہے
دل سے اٹھتا ہوا بادل تو برستا ہی نہیں

شوخیٔ لب میں وہ جادو ہے کہ تا دیر شمیمؔ
اس نے دیوانہ کہا بھی تو میں سمجھا ہی نہیں

●●

روشنی در پہ کھڑی مجھ کو بلاتی کیوں ہے
میں اندھیرے میں ہوں احساس دلاتی کیوں ہے

رات حصہ ہے مری عمر کا جی لینے دے
زندگی چھوڑ کے تنہا مجھے جاتی کیوں ہے

شہر کے لوگ تو سڑکوں پہ رہا کرتے ہیں
گھر بنانے کی لگن مجھ کو ستاتی کیوں ہے

آخری بات کو دوہراؤں گا آخر کب تک
تو مجھے نیند سے بیکار جگاتی کیوں ہے

گھر ہی سے بھی مرا ذوقِ سفر کم تو نہیں
راہ لیکن مرے قدموں کو چُراتی کیوں ہے

جاں بہ لب لمحۂ تسکیں مری قسمت ہے شمیمؔ
بے خودی پھر مجھے دیوانہ بناتی کیوں ہے

●●

○

اٹھتی بھیڑ کا ہر آدمی نرالا ہے
یہی تماشا ہے یا اور ہونے والا ہے

مرے وجود میں جینے لگا ہے چپکے سے
وہ ایک شخص جسے میں نے مار ڈالا ہے

خموش رات نے انگڑائیوں سے اُکتا کر
گداز جسم سے اس چاند کو نکالا ہے

نکل کے دور اندھیروں سے اتنا دیکھ سکے
زمیں کے چاروں طرف روشنی کا ہالہ ہے

خلوص دھوکا، محبت فریب، جُرم وفا
ہمارے شہر کا دستور ہی نرالا ہے

ہمارا ہاتھ جو پہلے کبھی لکیریں تھا
ہتھیلی کھول کے دیکھو تو چھالا چھالا ہے

تھکن سے چور ہوئی جا رہی ہیں کرنیں شمیمؔ
جلوس دن کا سہی، آخری اُجالا ہے

●●

خموشیوں سے کئی بار کی ہے میں نے بات
کبھی صفات کی صورت کبھی بہ شکلِ ذات

تمام شہر تمنّا سجائے بیٹھا ہوں
تمہاری راہگذر ہے کہ کاروانِ حیات

جو بیت جائے وہ اپنا ہے ہر کسی کے لئے
طلسمِ لمحۂ نو ہے بہ سازِ احساسات

کچھ اس ادا سے سلگتا رہا بدن میرا
مرے قریب سمٹتی رہی پگھلتی رات

ازل سے رشتۂ جاں تم سے تھا مرا موجود
تمہارا جسم ہے میرے لئے کوئی سوغات

یہ کس مقام پہ آکر ٹھہر گیا ہوں شمیمؔ
سکوتِ خواب عدم ہے نہ شورِ موجودات

○

سکوتِ شب کو جو الزام کی تلاش ہوئی
گلی گلی کو مرے نام کی تلاش ہوئی

نہ جانے کون سی جانب بہے یہ سیلِ رواں
جواں لہو کو اگر جام کی تلاش ہوئی

صلیب راس نہ آئی تو پی لیا تھا زہر
جنوں کو کب نہ کسی دام کی تلاش ہوئی

تمام کون و مکاں کا مآل ٹھہرے گی
وہ ایک صبح جسے شام کی تلاش ہوئی

چلی وہ رسم کہ پہچان سے بھی اکتا کر
روِشِ روِش کو رہِ عام کی تلاش ہوئی

حیات و موت کا دستور کب نرالا ہے
شمیمؔ کیوں تمہیں انجام کی تلاش ہوئی

●●

لوگ پابندِ سبک گامیٔ رفتار نہ تھے
راستے خود ہی کہیں چلنے کو تیار نہ تھے

اپنے چہروں سے نقابوں کو ہٹاتے کیسے
آئنہ دیکھنے والے کبھی ہشیار نہ تھے

گاؤں کے لوگ خلوص اور وفا کے پیکر
شہر میں آنے سے پہلے کبھی مکار نہ تھے

اتنا چاہا تھا کہ جی لیتے سمندر بن کر
ہم کبھی سیلِ رواں کے تو طلبگار نہ تھے

جن کے چہروں پہ رہا درد کا خاموش تناؤ
وہ کبھی آہ بھی کرنے کے سزاوار نہ تھے

سُرخ ہونٹوں پہ لکیروں کی گزرگاہوں کا
راستہ ڈھونڈنے والے کبھی اُس پار نہ تھے

انھیں ہاتھوں میں تھی زنجیرِ غلامی کی شمیمؔ
آج تک ہم ہی مگر برسرِ پیکار نہ تھے

●●

○

لبوں پہ سرخ لکیروں کا جال جیسا تھا
ترا تبسّم رنگیں خیال جیسا تھا

ملے ہو تم تو یہ احساس مٹ گیا ورنہ
مرا وجود کبھی اِک سوال جیسا تھا

حسین خواب کا ٹوٹا طلسم رنگیں تو
تمام شہر ہماری مثال جیسا تھا

نفس نفس میں سمایا ہے کیفیت بن کر
وہ ایک جذبہ جو خواب و خیال جیسا تھا

فراقِ یار کا عالم، وہ جان و دل کا زیاں
مآلِ عشق تو کیا تھا مآل جیسا تھا

شمیمؔ پوچھ رہے ہو کہ کس طرح گزری؟
تمہیں خبر ہی کہاں، میرا حال جیسا تھا

●●

لوگ ہیں وقت کی بیباک اڑانوں جیسے
اور ہم عہدِ گزشتہ کی تھکانوں جیسے

ہم جہاں رہتے ہیں اُس شہر کا عالم یہ ہے
سائے پیڑوں کے بھی لگتے ہیں مکانوں جیسے

کچھ قیامت کے سے آثار نظر آتے ہیں
حادثے ہونے لگے روز فسانوں جیسے

دشتِ تنہائی تھا یا نقشِ قدم کا صحرا
ہر طرف خیمے نظر آئے ٹھکانوں جیسے

تیر چلتے رہے خاموش سیہ راتوں میں
جسم کھنچتے رہے مضبوط کمانوں جیسے

اب یہ اقرارِ وفا ہو کہ ملے قربِ شمیمؔ
دل پہ کچھ حرف ہیں برفیلی چٹانوں جیسے

○

شکستِ خواب کا خاموش ترجماں جیسا
مرا وہ شعلۂ جاں ہو گیا دھواں جیسا

بچا لیا ہے مصائب کی دھوپ سے مجھ کو
تمہارا پیار تو لگتا ہے سائباں جیسا

نہ جانے گزرے وہ عالم کہ اب نہیں ہم پر
دکھائی دیتا تھا اک سخت امتحاں جیسا

جو بہہ رہا ہے سمندر میں وہ لہو تو نہیں
یہ سر پہ کیا ہے مرے سرخ آسماں جیسا

میں زخم خوردہ پرندہ ہوں، پھڑپھڑاتا ہوں
تمہارا جسم ہے کھنچی ہوئی کماں جیسا

وہ ایک شخص سڑک پار کرنے نکلا تھا
کہ سلسلہ تھا کوئی مرگِ بے اماں جیسا

جسے میں چھوڑ کے آیا ہوں تنگ آ کے شمیمؔ
یہاں بھی شورِ قیامت ہے اُس مکاں جیسا

●●

○

دن کو ڈھکیل آیا صعوبت کے غار میں
بیٹھی ہوئی تھی رات مرے انتظار میں

پہچان بن کے مجھ میں سمائے تھے جو اُصول
نکلا ہوں ڈھونڈنے انھیں اپنے شعار میں

اِک اجنبی سی بھیڑ میں احساس یوں ہوا
میرا وجود ہے بھی تو ہے کس شمار میں

خود کو بھی بھول جاؤں تمہیں یاد جب کروں
کتنی سپردگی ہے مرے اختیار میں

دیوار و در پہ ہیں وہی وحشت کی یورشیں
گھر بھی بنا کے دیکھ لیا لالہ زار میں

دشتِ طلب میں پھول نہ جب کوئی کھل سکا
تتلی نے پر سمیٹ لیے انتظار میں

جوشِ طلب کے ساتھ رہا دل کا قافلہ
گزری شمیمؔ عمر مری رہگذار میں

●●

ہمارے دیدۂ دل پہ عیاں بہت کچھ ہے
وہ ایک بات کہ جس کا گماں بہت کچھ ہے

تڑپ کے خاک ہوئے ہیں ہزار پروانے
سسکتی شمع کا اٹھتا دھواں بہت کچھ ہے

خموش جھیل میں پتھر نہ پھینکیے صاحب
کہ سطحِ آب کے نیچے رواں بہت کچھ ہے

شریک درد ہمیں کر لیا ہے زخموں نے
خودی کو رشتہ جاں سے زیاں بہت کچھ ہے

زمین پانی ہی پانی، فلک ہوا ہی ہوا
یہ کائنات رواں اور دواں بہت کچھ ہے

فصیلِ شہر سلامت رہے شمیم کہ اب
ہمارے شہر میں امن و اماں بہت کچھ ہے

●●

○

اس شہر میں تو عام یہ دستور ہوگیا
ہر شخص اپنی ذات میں مستور ہوگیا

اپنے طلسمِ ذات میں کھویا ہوا تھا میں
تجھ سے ملا تو اور بھی مسحور ہوگیا

میرے قریب آنے کی تھی جس کو جستجو
آواز دی تو اور بھی وہ دور ہوگیا

اِدراک اس قدر کہ ہر اک شے خدا لگے
دیوانہ ہوشیار تھا منصور ہوگیا

سیلاب ایسا آیا کہ دنیا پکار اُٹھی
دریا زمیں کی کوکھ کا ناسور ہوگیا

آئینہ تمام ہوئے ہم تو اے شمیم
عکسِ جمالِ یار بھی مغرور ہوگیا

●●

○

تنہائیوں کی بھیڑ سی اک دل کے پاس ہے
پہچان لے گا وہ بڑا چہرہ شناس ہے

میں زندہ بچ گیا ہوں تو وہ خود بھی بچ گیا
قاتل کو ڈھونڈھ لو کہ ابھی آس پاس ہے

صدیوں کو کر چکا ہوں خوشی سے جو ہمکنار
وہ لمحہ اپنے آپ میں کتنا اُداس ہے

ہونٹوں پہ بات، آنکھوں میں غم، چہرہ ملتجی
تصویر پر بھی چھائی ہوئی کوئی پیاس ہے

سارا نظام خود میں سمیٹے ہوئے ہے جو
اُس زندگی پہ دیکھئے کتنا ہراس ہے

نیلی، ہری، سنہری خوشی ڈھونڈتے ہیں لوگ
میری نظر میں چاروں طرف ہی کپاس ہے

سارے ہی رشتے ٹوٹ چکے ہیں مگر شمیمؔ
اک دل ہے جس کو آج بھی تیری ہی آس ہے

●●

○

وہ ایک شخص جو اپنا دکھائی دیتا ہے
زمانے بھر سے نرالا دکھائی دیتا ہے

رگوں میں دوڑتا پھرتا دکھائی دیتا ہے
وہ ایک جذبہ لہو سا دکھائی دیتا ہے

اٹھائے پھرتا ہے کاندھوں پہ جو صلیب مری
وہی جہاں کو مسیحا دکھائی دیتا ہے

بہت خلوص سے ملتا ہے شہر میں رہ کر
ابھی وہ گاؤں سے آیا دکھائی دیتا ہے

سنائی دیتی ہے اک بازگشت آہوں کی
اُداس جب ترا چہرہ دکھائی دیتا ہے

یہ اعتبار کہ تم ہو مری نظر کے قریب
مرا خلوص سراپا دکھائی دیتا ہے

فصیلِ شب سے گزرتے ہیں روز اِس دُھن میں
سویرا ہو تو اجالا دکھائی دیتا ہے

یہ انتشار کہاں لے کے جائے گا آخر
کہ اب وجود بھی صحرا دکھائی دیتا ہے

فرازِ آدمِ خاکی کی بات ہو تو شمیمؔ
یہ آسمان بھی نیچا دکھائی دیتا ہے

●●

○

جاگتے لمحوں سے جب اپنا بدن چمکائے گی
رات کی ناگن بھیانک اور بھی ہو جائے گی

سرخ بادل وحشتیں برسا رہے تھے رات دن
اب کوئی آندھی چلی ہے سب اڑا لے جائیگی

ذہن جب تعبیر کے جنگل میں گم ہو جائے گا
خواب کی ہر بات اپنے آپ کو دوہرائیگی

لمس اک آواز بن کر جب پکارے گا اُسے
جسم کی رنگت مری آغوش میں مسکائے گی

چاندنی، خوشبو، ہوا اور روشنی کس کی ہوئی
میں تو خود اپنا نہیں ہوں وہ مجھے کیا پائے گی

حرفِ آخر آج ہر اک بات لگتی ہے جسے
اپنی حالت پر اسے بھی کل ہنسی تو آئے گی

زندگی کو خوبصورت جام کہتا ہے شمیمؔ
مے اگر پینے لگا تو عقل بھی آجائے گی

●●

○

بدلتے موسموں کی بات ہوگی
تمہارے رُو برو برسات ہوگی

سحر سرگوشیوں میں پوچھتی ہے
بتاؤ کیا کبھی پھر رات ہوگی

سویرا چپکے چپکے پوچھتا ہے
بتاؤ کیا کبھی پھر رات ہوگی

چھپایا تھا جسے ہر اِک صدی نے
وہی بے چہرگی اب ذات ہوگی

یہی دستور شہرِ درد کا ہے
سبھی کے ہاتھ میں سوغات ہوگی

اگر آواز پا صورتِ جرس ہو
ہر اک منزل تمہارے ساتھ ہوگی

شمیمؔ اپنی لگن سے کام رکھو
کبھی تقدیر کو بھی مات ہوگی

●●

○

جان و دل پر بار تھا جس کے لہو کا سلسلہ
آستیں در آستیں ہے اُس عدو کا سلسلہ

دیدۂ شب نے کہاں دیکھا تھا وہ رنگِ سُراب
خواب سے تعبیر تھا جس کی نمو کا سلسلہ

آفتاب تازہ روشن ہو گیا ہے شام سے
صبحِ رنگیں ہے کوئی جام و سُبو کا سلسلہ

عہدِ سنگ و خشت ہے نجم و مہ و خورشید تک
اور پہنچے گا کہاں تک جستجو کا سلسلہ

کیا خبر تھی شہرِ رسوائی سے گذرے گا کبھی
جس کو ہم سمجھے تھے اپنی آبرو کا سلسلہ

جیب دواماں کو سیا تھا، دل بھی سی لیتے مگر
زندگی اُکتا گئی اب کیا رفو کا سلسلہ

●●

○

سلگتی شمع دھواں دے رہی ہے آوارہ
کہیں اندھیرا، کہیں روشنی ہے آوارہ

زمیں نے چاند کو سورج سے کر دیا روپوش
گلی میں پھیلی ہوئی چاندنی ہے آوارہ

نئے نئے ہمیں الزام لوگ دیتے ہیں
کسے بتائیں کہ خود یہ صدی ہے آوارہ

خلوص جب سے گناہوں میں بھی نہیں ملتا
فصیلِ شہر میں آوارگی ہے آوارہ

نفس نفس جسے لیجا رہا ہے سوئے وصال
قدم قدم پہ وہی زندگی ہے آوارہ

حرم سے دَیر و کلیسا کے فاصلوں میں شمیم
خدا وہی ہے مگر بندگی ہے آوارہ

●●

○

رگ و پے کی شہزادگی ہے سمندر
ازل سے ابد زندگی ہے سمندر

اُتر جاؤ گہرائیوں میں صدف کی
یہی صوت نغمہ، یہی ہے سمندر

پریشانیاں ہیں کبھی زندگی کی
کبھی روز و شب کی ہنسی ہے سمندر

ضعیفی کا گہرا تفکّر کبھی ہے
کبھی طفلِ نو کی ہنسی ہے سمندر

جھگڑتے ہیں جب ہم بہت بولتے ہیں
ہماری تمہاری کمی ہے سمندر

بدلتی رہی دوستی روپ لیکن
اَزل تا اَبد دشمنی ہے سمندر

شمیمؔ آدمی کا عجب حال دیکھا
کبھی صرف نغمہ، کبھی ہے سمندر

●●

○

اپنی ہستی کا آئنہ مجھ میں
جان لیوا ہے سلسلہ مجھ میں

میری تنہائیوں کا ساتھی وہ
انجمن انجمن رہا مجھ میں

ساتھ دیتا ہے زندگانی کا
وہ جو اک شخص مر گیا مجھ میں

شور ہے ہر طرف بلاؤں کا
جی رہی ہے کوئی دعا مجھ میں

توڑتا ہوں انا یزیدوں کی
اب بھی زندہ ہے کربلا مجھ میں

مجھ کو الفاظ مل سکے نہ شمیمؔ
گونجتی رہ گئی صدا مجھ میں

●●

○

پل بھر میں پگھلتے ہوئے لمحے کی طرح ہے
وہ شخص تو اک موم کے ٹکڑے کی طرح ہے

آنکھوں میں سمائے نہیں تھمتا تھا جو آنسو
دامن پہ مرے خون کے دھبّے کی طرح ہے

جب صفحۂ عالم پہ پڑیں میری نگاہیں
دیکھا کہ یہ دنیا کسی نقطے کی طرح ہے

ہر لمحہ روانی میں ہے کچھ اور ہی تیزی
جذبات کی رَو بھی کسی چشمے کی طرح ہے

فرقت کے شب و روز تھے صدیوں پہ بھاری
قربت کی حسین شام کہ لمحے کی طرح ہے

خود اپنا محافظ ہے نہ اوروں کا سہارا
انساں بھی کسی پیڑ کے پتّے کی طرح ہے

دامن کو شمیم اپنے بچاؤ گے کہاں تک
یہ عشق لپکتے ہوئے شعلے کی طرح ہے

●●

○

نہ جانے دل کو تمنا کا کچھ صلہ بھی ملا
کسی کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا بھی ملا

عجب سفر تھا خود اپنی ہی ذات سے باہر
جہاں گیا مجھے کوئی سراب سا بھی ملا

وہ جس کا ظلم دھماکے تھے، آگ تھی، رَن تھا
تمام شہر اسی کو پکارتا بھی ملا

یہ کیسی آگ ہے، لے جا رہی ہے مجھ کو کہاں
یہ کیسا دشت ہے جس میں مجھے خدا بھی ملا

لکھی ہیں دورِ رفاقت نے ایسی تحریریں
ہمارا نام سرِ مقتلِ وفا بھی مِلا

شمیم اہلِ سیاست کی بات کرتے ہو
بتاؤ ان میں تمہیں کوئی رہنما بھی ملا

●●

○

خوش فہمیوں کا ذہن میں فقدان کر گیا
وہ یوں ہنسا کہ مجھ کو پشیمان کر گیا

غم کی امانتوں سے سبکدوش کر کے وہ
مجھ کو اُداسیوں کا نگہبان کر گیا

آئینہ دے کے ہاتھ میں روپوش ہو گیا
کیسا ستم یہ مجھ پہ مری جان کر گیا

تھی حرف حرف داستاں جس کی وہ کس لئے
اوراقِ زندگی کو پریشان کر گیا

بس اک نظر میں لے گیا سب کچھ وہ لوٹ کر
مجھ کو خود اپنے آپ سے انجان کر گیا

جو مسئلہ تھا صدیوں سے زیرِ بحث
کچھ بھی کہے بنا ہی وہ آسان کر گیا

واقف رہے کہ اجنبی اپنے بدن سے ہم
جی چاہتا ہے پوچھ لیں اب پیرہن سے ہم

کل رات نیند کیوں نہیں آئی، کہاں رہے
بستر بچھا ہوا ہو تو پوچھیں شکن سے ہم

کل بھی ہیں کام، کل بھی وہی ولولے تمام
سو جائیں رات بھر تو لیٹ کر تھکن سے ہم

مدت ہوئی شمیم کہ ہم وہ نہیں رہے
رکھتے ہیں اب تو کام ہی اپنی لگن سے ہم

●●

○

آنسوؤں کا حساب مت رکھنا
گھر میں غم کی کتاب مت رکھنا
آئینہ سامنے اگر ہو تو !
رُخ پہ اپنے نقاب مت رکھنا
گھر کو بھر لینا روشنیوں سے
جیب میں آفتاب مت رکھنا
اک سوال اور بھی کھڑا کر دے
ایسا کوئی جواب مت رکھنا
جاگتی رات بن کے چبھتے ہیں
اپنی پلکوں پہ خواب مت رکھنا
بانٹ دینا مسرتیں سب کو
خود سے بھی اجتناب مت رکھنا
ہر نئے دور کے تقاضوں پر
تہمتِ انقلاب مت رکھنا
فرقہ وارانہ بربریت سے
کام عالی جنات مت رکھنا
جھوٹی سچی کہانیاں سن کر
اپنے سر پر عذاب مت رکھنا
بس یہی لطف زندگی ہے شمیم
دل کی دنیا خراب مت رکھنا

●●

○

وہی ہے اب جو ترا انتظار پہلے تھا
کچھ اپنے دل پہ مگر اختیار پہلے تھا

خزاں نصیب غمِ دل کے ریگزاروں میں
امید کا شجرِ سایہ دار پہلے تھا

اب آسمانوں سے آگے اڑان بھرتا ہوں
درونِ ذات خلا کا حصار پہلے تھا

اب آئینے در و دیوار بن کے ہنستے ہیں
گلی گلی میں پریشاں غبار پہلے تھا

عجیب الجھنیں پیش آ رہی ہیں، کیا کیجے
زمانہ ہم پہ بہت سازگار پہلے تھا

شمیم کیا ہوا اپنا رفیق بھی نہ رہا
وہ ایک شخص جو یاروں کا یار پہلے تھا

●●

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

○

پرندوں کو شجر اپنا لگے ہے
مجھے جیسے یہ گھر اپنا لگے ہے

نہیں ہے غم کہ مٹ جائیگی دنیا
قیامت ہو تو ڈر اپنا لگے ہے

خلاؤں میں چھپا بیٹھا تھا کوئی
مگر اب ہمسفر اپنا لگے ہے

انا کو جب سے اپنی توڑ ڈالا
مجھے قدموں پہ سر اپنا لگے ہے

اندھیری رات سناٹوں کا جنگل
بہت بھاری سفر اپنا لگے ہے

شمیم اس شہر میں ہشیار رہنا
یہاں تو ہر بشر اپنا لگے ہے

●●

آئینہ خانے کے باہر ہم ہیں
لوگ کہتے ہیں کہ پتھر ہم ہیں

اجنبی سمجھا ہے دنیا نے ہمیں
اور اسی دنیا کے خوگر ہم ہیں

آسماں سر پہ، زمیں قدموں میں
اپنے ہی قد کے برابر ہم ہیں

ظلم سے لڑنا ہمیشہ حق ہے
آؤ کہہ دیں کہ بہتر ہم ہیں

آگ اور خون تمہارا مقصد
رنگ اور نور کا پیکر ہم ہیں

دن کی پازیب بنے سرگرداں
رات کے ماتھے کا جھومر ہم ہیں

ہم نے ہنس ہنس کے سہے ظلم و ستم
سچ تو یہ ہے کہ ستمگر ہم ہیں

نیند چبھنے لگی آنکھوں میں شمیم
خار کہتے ہیں کہ بستر ہم ہیں

○

جس کی اپنے سے پہل ہو وہ سفر کیسا ہے
منتہا میں نہ نکل جاؤں یہ ڈر کیسا ہے

کوئی ہمدرد ہے نہ ہے اہلِ تماشا کوئی
بیچ بستی میں یہ جلتا ہوا گھر کیسا ہے

بُلبلے پانی پہ بنتے ہیں بگڑ جاتے ہیں
اور جو صدیوں سے کھڑا ہے وہ شجر کیسا ہے

خواب آنکھوں میں نہ ہونٹوں پہ تبسم کی لکیر
کیسی وحشت ہے یہ بستی پہ اثر کیسا ہے

ہم کو مرنے کی ادا بھی نہیں آتی ہے شمیمؔ
زندہ رہنے کا یہ لوگوں میں ہنر کیسا ہے

یہ زمیں آسمان خالی ہے
جب سے دل کا مکان خالی ہے

شاہراہوں پہ آگئیں اجناس
ہر کسی کی دوکان خالی ہے

لوگ رہنے لگے ہیں کمروں میں
وہ کھلا سائبان خالی ہے

تیر سارے چلادیے اس نے
اب کشیدہ کمان خالی ہے

دیکھیے تو نگاہ میں سب کچھ
سوچیے تو جہان خالی ہے

اے شمیمؔ اب کہاں وقارِ زیست
بس یونہی آن بان خالی ہے

●●

○

آئنہ بن کے مرے سامنے رہنے والا
کون ہے یہ مجھے ہر حال میں سہنے والا

مجھ کو خود سے بھی کہیں دور لیے جاتا ہے
ایک دریا مرے اندر ہے جو بہنے والا

دشتِ تنہائی سے گزرے تو یہ محسوس ہوا
کوئی بھگوان ہی ہوگا اِسے سہنے والا

دل کو بے ربطیٔ جاں سیل بلا لگتا ہے
کاش آجائے کوئی ناؤ کو کھینے والا

اے شمیم اپنے بدن کے لیے آسائش کیوں
یہ مکاں زود ہے ہر حال میں ڈھنے والا

●●

یہ جو نادانیاں ہماری ہیں
کُل پریشانیاں ہماری ہیں

مشکلیں ہم سے دور دور رہیں
صرف آسانیاں ہماری ہیں

سارے الزام بھی ہمیں جھیلیں
ساری قربانیاں ہماری ہیں

آئنہ عکسِ ذات میں گم ہے
آج حیرانیاں ہماری ہیں

ولولے ہم پہ راج کرتے ہیں
خواہشیں رانیاں ہماری ہیں

رنگ اور روشنی کے پردوں میں
گھور من مانیاں ہماری ہیں

مسکرانے لگی فصیلِ شہر
یہ نگہبانیاں ہماری ہیں

اے شمیم انتظارِ فردا میں
صرف عریانیاں ہماری ہیں

●●

○

اپنے بدن کی آنچ میں تپ کر لگا مجھے
سورج تھا جو کہ چاند سا پیکر لگا مجھے

اندر کے موسموں کا اثر بھی عجیب تھا
وہ جسم موم اور کبھی پتھر لگا مجھے

آنکھوں میں شوخی، لب پہ ہنسی جسم میں گداز
کچھ آج وہ زیادہ ہی سندر لگا مجھے

دنیا کی بات کیا کہ اگر کام پڑ گیا
خود اپنے آپ سے بھی بہت ڈر لگا مجھے

تنہائیوں کے دشت میں ہے انجمن تمام
انساں کہ قطرہ ہو کے سمندر لگا مجھے

کھل کر جو عیب سب کو بتاتا رہا مرے
دشمن وہ دوستوں سے بھی بڑھ کر لگا مجھے

میں نے شمیم دیکھا ہے دنیا کو پاس سے
اپنا جو حال تھا وہی گھر گھر لگا مجھے

●●

○

زرد پتّے سب اُڑا لے جائے گی
اور تو کیا یہ ہوا لے جائے گی

رات کی وادی میں جینے کے لیے
وحشتِ غم آئنہ لے جائے گی

جسم و جاں کی قید سے آگے کہیں
آگہی زعمِ بقا لے جائے گی

زندگی سرمستیوں میں ڈوب کر
خواب آنکھوں سے چُرا لے جائیگی

دیکھنا کل بھی سحر کے آس پاس
باغ میں مجھ کو صبا لے جائے گی

جب تجلی فرما ہو گی روشنی
وادیوں میں اک ندا لے جائیگی

وحشیوں کو شہر ہیں آرام گاہ
اور جنگل میں قضا لے جائے گی

بازگشت روزِ ازل کی یہ شمیم
اب کہاں مجھ کو اُڑا لے جائے گی

●●

○

دنیا کی انگوٹھی میں نگینہ سا لگے ہے
گھر اپنا سمندر میں سفینہ سا لگے ہے

ہر شخص بنائے ہے خود اپنے کو عجوبہ
یہ شہر میں جینے کا قرینہ سا لگے ہے

دل جس کو لہو سے ہی کیا جاتا ہے مربوط
بیتی ہوئی یادوں کا خزینہ سا لگے ہے

مکاری و بدمستی و بے روح خوشامد
اس دور میں شہرت کا یہ زینہ سا لگے ہے

جیتا ہے شمیم اپنے لیے کون یہاں پر
اوروں کے لیے جسم دفینہ سا لگے ہے

●●

ہم نے جو کسی خواب کو تعبیر کیا ہے
دنیا کی ہر اک چیز کو جاگیر کیا ہے

جو بول رہا تھا اسے یوں کر دیا خاموش
جیسے کسی سیلاب کو تصویر کیا ہے

اس آنکھ نے اک تیرے سوا کچھ بھی نہ دیکھا
اس دل کو تری زلف نے زنجیر کیا ہے

اک پیار کی یادوں میں غزل ہم نے کہی ہے
اک تاج محل ہم نے بھی تعمیر کیا ہے

خود اپنے مسائل پہ توجہ نہ دی جس نے
دنیا کے غموں نے اسے دلگیر کیا ہے

کچھ شعر تو کچھ عیسیٰ سے سبق سیکھ کے ہم نے
زہراب کو اپنے لیے اکسیر کیا ہے

کیا اس کا جواب آتا ہے دیکھیں گے شمیم اب
خط یوں تو بڑے شوق سے تحریر کیا ہے

●●

میڈیکل نظمیں

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

پلاسٹک سرجری

(ایک لڑکی کے پلاسٹک سرجری سے پہلے اور بعد کے تاثرات)

ڈاکٹر تو نے نیا روپ عطا کر کے مجھے
میری خاموش امنگوں کو زباں بخشی ہے

میرے افکار کی دنیا میں نہ تھی خود داری
ذہن اپنے ہی تصوّر سے ہوا تھا عاری
اپنی ہستی کا تصوّر جو کبھی آتا تھا
ایک نشتر سا رگِ جاں میں اتر جاتا تھا
بار بار اپنے ہی چہرے پہ نظر جاتی تھی
اور بگڑی ہوئی ہیئت پہ ٹھہر جاتی تھی
نقش کچھ زیر و زبر میرے ہوئے تھے ایسے
خالقِ کُل نے بنایا ہو نمونہ جیسے
دیکھتا جب کوئی عبرت کی نظر سے مجھ کو
کوفت ہوتی مرے احساسِ بشر سے مجھ کو
تیری تجویز پہ مٹنے کا ارادہ لے کر
آخرش آئی ترے پاس تمنا لے کر
اک تمنا کہ جو موہوم سی لگتی تھی مجھے
ایک نعمت کہ جو محروم سی لگتی تھی مجھے
تو نے پھر سحر کیا عالمِ بے ہوشی میں
کیا سے کیا مجھ کو کیا عالمِ بے ہوشی میں

قابلِ قدر جراحت کا نتیجہ ہی کہوں
مجھ پہ اللہ کی رحمت کا نتیجہ ہی کہوں
سب سمجھنے لگے کچھ اپنی نظر میں مجھ کو
اہمیت ملنے لگی اپنے ہی گھر میں مجھ کو
کبھی خوش فہمئ بے حد مجھے ہو جاتی ہے
کبھی بدلی ہوئی حالت پہ ہنسی آتی ہے
دل میں اٹھتے ہیں کبھی چاہ کے ارمان بہت
الغرض ہو گئے اب جینے کے سامان بہت

میری خاموش امنگوں کو زباں بخشی ہے
ڈاکٹر تو نے نیا روپ عطا کر کے مجھے

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

خون کا سودا

(پیشہ ور خون بیچنے والوں سے متاثر ہو کر)

چند سکّوں کے عوض اپنی کفالت کے لیے
خون کا سودا بہت مہنگا پڑے گا یارو

تم کو معلوم نہیں خون کی قیمت کیا ہے
خون کے سامنے سکّوں کی حقیقت کیا ہے
خون دینا ہی اگر بھوک سے دیتا ہے نجات
کیوں لیے پھرتے، وجسموں میں اسے پھر بے بات
دورِ مے چلتا رہے، بزم میں ساقی نہ رہے
ہم تو جب جانیں کہ اک بوند بھی باقی نہ رہے

تم کو معلوم ہے یہ خون کہاں جاتا ہے
اُن امیروں ہی کے کنبے کو دیا جاتا ہے
جن سے تم کو ہے شکایت کہ لہو پیتے ہیں
مار رکھا ہے ہمیں اور یہ خود جیتے ہیں

جب یہ زردار کبھی پڑتے ہیں بیمار شدید
خون دینے ہی سے رہ جاتی ہے باقی اُمید
کیوں کسی اپنے پہ ایثار کی نوبت آئے
دی رقم اور یہ بکتا ہوا خوں لے آئے

تم سمجھتے ہو کہ ہے خون کا دریا جاری
بیچ دینے سے بھلا فرق کہاں ہوتا ہے
چار دن کے لیے جسموں میں کمی رہتی ہے
پھر وہی خون وہی جوش رواں ہوتا ہے
کون بتلائے تمہیں خون کا اک اک قطرہ
جسم کا روحِ رواں حاصل جاں ہوتا ہے

تم کہ سہتے بھی ہو ایجاد بھی کرتے ہو ستم
خون پھر خون ہے کس طرح گوارا کرلے
جیسے تم خود ہی نکلواتے ہو اس کو جا کر
یہ بھی اک روز اگر تم سے کنارا کرلے
سانس کیا چیز ہے دھڑکن کا بھی امکان رہے
تیل جل جانے سے جس طرح چراغاں نہ رہے

تم تو کرتے ہو کمی جسم میں پیدا لیکن
خون خود اپنی کمی پوری کیے جاتا ہے
حد بھی ہوتی ہے وفاداری و مستعدی کی
دورِ تخلیق میں بھی ساتھ دیے جاتا ہے
پھر بھی جاں سوزی و ایثار کا جذبہ کب تک
ساتھ تو دے گا مگر خون بنے گا کب تک

خدمتِ خلق ہے یہ اس میں تجارت کیسی
دوستو غور کرو، فرض کا احساس کرو
جن کو اک بوند بھی کوئی نہیں دینے والا
ان تڑپتے ہوئے لوگوں کا بھی کچھ پاس کرو
کیا وہ امید نہیں رکھتے کہ کوئی غم خوار
آئے گا عزم جواں لے کے کرے گا ایثار

مستحق رحم کا ہے جب ہو کوئی بھی بیمار
وہ ہو زردار کوئی یا کوئی مفلس نادار
اک تڑپتے ہوئے انسان سے کیسی تفریق
ایک دم توڑتے بیمار کو کیسا انکار
ان کی امداد ہے اک فرض نبھانا جیسے
اک بلکتے ہوئے بچے کی سُنے کوئی پکار

جب نکلتا ہو کوئی کام کسی کا تم سے
خون کیا چیز ہے تم جان بھی قرباں کر دو
جن کے اپنوں کا لہو میچ نہیں ہوتا ہو
مشکلیں بڑھ کے ذرا ان کی بھی آساں کر دو
تم اگر خون کو بیچو گے تو رسوا ہو گے
اپنے اعمال نہ بدلو گے تو پسپا ہو گے

چند سکّوں کے عوض اپنی کفالت کے لیے
خون کا سودا بہت مہنگا پڑے گا یارو

روح رواں

(خون چڑھانے کی اہمیت پر)

جب زندگی کی راہ میں آیا تھا اِک وَبال
ہر سانس آ رہی تھی لیے بس یہی سوال
جو خون کی کمی ہے بھلا کیسے پوری ہو
یہ روح جسم میں رہے یا اس سے دوری ہو
اِیثار کر سکے کوئی ہمدم بنے کوئی
تجویز یہ ہوئی کہ مجھے خون دے کوئی
پھر جانے کس کا خون مرے خون سے ملا
اور ٹل گیا کہ خطرہ تھا جو بھی لگا ہوا
صحت نصیب ہو گئی، آرام مِل گیا
پھر زندگیٔ تازہ کا پیغام مِل گیا
لیکن یہ آج بیٹھے بٹھائے ہوا ہے کیا
میں سوچتا ہوں کس نے مجھے خون دے دیا
وہ کون تھا کہ جس کی حرارت رگوں میں ہے
جس کے لیے نیاز کا جذبہ نسوں میں ہے
وہ میرے پاس آئے تو آنکھیں بچھاؤں میں
پہناؤں ہار باہوں کے دل میں بٹھاؤں میں
وہ وقت آئے فرض کو اپنے نبھا سکوں
اے کاش میں بھی اس کے کسی کام آسکوں

فنگر پرنٹس

جو میرا امتیاز ہیں، میری دلیل ہیں
وہ صرف انگلیوں کے نشانات ہیں مرے

میرے وجودِ خاک میں سب کچھ ہے کیا نہیں
لیکن ہے جو بھی کچھ وہ کسی سے جدا نہیں
ہر وقت سب کے سامنے دل کی کتاب ہے
یوں دیکھئے تو چہرہ مرا لاجواب ہے
طلعت جبینِ شوق کی ہے غیرتِ قمر
بالا ہے سرو سے قدِ رعنا مرا مگر
انسانیت میں کیا ہے کوئی بات ہی نہیں
اس طرح دیکھئے تو مری ذات ہی نہیں
لیکن یہ انگلیوں کے نشاں بے نظیر ہیں
میرے ثباتِ ذات کے گویا سفیر ہیں
رہتے ہیں میرے ساتھ یہ دَمساز کی طرح
مجھ کو نصیب ہیں کسی اعزاز کی طرح
بے مثل ہیں یہ جیسے کہ منصور کا مقام
اور منفرد ہیں جیسے کہ غالبؔ کا ہو کلام

ستھرے ہوئے نئے ادبی ذوق کی طرح
پیچیدہ ہیں مگر یہ رہِ شوق کی طرح
چہرہ ملے، مزاج ملے، خانداں ملے
لیکن کسی سے بھی نہ کبھی یہ نشاں ملے

جو میرا امتیاز ہیں، میری دلیل ہیں
وہ صرف انگلیوں کے نشانات ہیں مرے

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

دردِ دل

آج جو درد اٹھا سینے میں بیٹھے بیٹھے
ایسا بے ہوش ہوا، اپنی خبر بھی نہ رہی
لوگ کہتے ہیں کوئی درد اٹھا تھا دل میں

سوچتا ہوں کہ نہیں تھی یہ نئی بات کوئی
حادثہ یہ تو ہمیشہ ہی ہوا کرتا ہے
چند ناکام امنگوں کا سہارا لے کر
آئے دن درد مرے دل میں رہا کرتا ہے

میرے سینے میں بسا ہے کسی مایوس کا غم
میرے ہونٹوں پہ سجا ہے کسی مظلوم کا درد
میری آہوں میں چھپی ہے کسی مجبور کی لے
میری ہستی سے عیاں ہے کسی معصوم کا درد

میرے افکار پہ ہے مہرِ غمِ ہستی کی
میرے احساس پہ ہے کرب کا عالم طاری
میری آنکھوں میں ہے اس غارِ ہلاکت کا سماں
زندگی آج بھی انساں پہ جہاں ہے بھاری

بھوک کی دھوپ سے جھلسے ہوئے چہروں پہ ابھی
بے بسی اور غریبی کے ہیں سائے رقصاں
اسی افلاس کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں
آج تہذیب کا پیکر بھی ہوا ہے عُریاں

چند سکوں کے عوض، آج بھی عصمت کی نقاب
یوں اُلٹ جاتی ہے جیسے یہ کوئی بات نہیں
دعوتِ عیش نہ دیتی ہو سیہ کاروں کو
میرے نزدیک زمانے میں کوئی رات نہیں

یہ عداوت کی فضائیں، یہ اُخوت کی کمی
رنجشیں دل میں یہ آنکھوں میں مروّت کی کمی
حد پہ پہنچی ہوئی یہ آج محبت کی کمی
روز اک درد مرے دل میں جگا دیتی ہے
روز اک آگ سی سینے میں لگا دیتی ہے

آج جو درد اٹھا سینے میں بیٹھے بیٹھے
ایسا بے ہوش ہوا اپنی خبر بھی نہ رہی
لوگ کہتے ہیں کوئی درد اٹھا تھا دل میں

آنکھ کا جالا

دھند ہے صرف مری آنکھوں میں
لوگ کتنے ہیں آج بھی اندھے
اُن کا بھی کچھ علاج تو ہوگا

اہلِ زر کی نگاہ پر اب بھی
سیم و زر کے دبیز پردے ہیں
جن کو یہ بھی نظر نہیں آتا
لوگ کیسے یہاں پہ جیتے ہیں

عشق کے مدّعی ہیں اہلِ ہوس
اور دم بھی وفا کا بھرتے ہیں
حُسن والوں کو کیا ہوا لیکن
کیسے یہ لوگ اُن پہ مرتے ہیں

حال پوچھو نہ اب سیاست کا
دشمنِ قوم ہیں کئی لیڈر
خون پیتے ہیں جیبیں بھرتے ہیں
پھر بھی جنتا پہ ہے انھیں کا اثر

ایسے ماحول میں ذرا سوچو
مجھ کو جالا یہ کیوں عزیز نہ ہو
زخمِ احساس سے تو اچھا ہے
ایسی چیزوں میں کچھ تمیز نہ ہو

●●

حسنِ بیمار

بسترِ مرگ پہ لیٹی ہے جواں سال مریض !
اپنے پیکر میں سمیٹے ہوئے بیمار سا حُسن !

اس کی زلفوں کی گھٹاؤں میں چمک وہ نہ رہی
اس کے عارض کی شعاؤں میں دمک وہ نہ رہی
اس کی آواز کے شعلوں میں لپک وہ نہ رہی
اس کے انفاس میں بھینی سی مہک وہ نہ رہی
ایک ناکام محبت کی کہانی کی طرح
اجڑی اجڑی سی ہے ویران جوانی کی طرح

اس کی خاموش نگاہوں میں ہے جھیلوں کا سکوت
جس میں ہر روز امیدوں کے کنول کھلتے ہیں
پردۂ ذہن پہ چھا جاتے ہیں یادوں کے نقوش
جیسے خاموش سے ماحول میں لب ہلتے ہیں

اس کے پژمردہ سے چہرہ پہ ہیں نظریں میری
اور احساس کی دنیا میں ہے طوفان بپا
اس تصور سے مرا ذہن ہوا ہے مفلوج
اس کی تقدیر میں ہونا ہے نہ جانے کیا کیا

اس کو مل جائے جو صحت کا پیام رنگیں
زندگی اور جو کچھ روز کی مہمان رہے
اس کو حاصل ہو مسرت کا بہاروں کا پیام
بن کے وہ حسن و محبت کی نگہبان رہے

آخر اک دن اسے پھر حسنِ جواں کی خاطر
اپنے احساس کی تصویر میں ڈھلنا ہوگا
اپنی بے باک نگاہی کو سمجھ کر الزام
پھر اُسے نظروں کا انداز بدلنا ہوگا

اس کے احساس پہ چھائے گا جوانی کا نشہ
اور نظروں میں یہ دنیا ہی بدل جائے گی
جب چلے گی کبھی پُروائی حسیں موسم میں
اس کی خاموش طبیعت بھی مچل جائے گی

ایک پُرکیف سے ماحول کی خوشبو پاکر
دل کو رہ رہ کے ستائیں گی کسی کی یادیں
شامِ فرقت کی دلآویز سی تنہائی میں
خون کے آنسو بھی رُلائیں گی کسی کی یادیں

اس کی خاموش محبت کی صداقت اک دن
کامیابی کے حسیں بام پہ آجائے گی
مژدۂ فصلِ بہاراں کی پیامی بن کر
گردشِ وقت بھی اِک بار چلی آئے گی

وہ بھی وابستۂ دامانِ نگہباں ہوگی
اس کے ماحول میں بھی ہوں گی بہاریں رقصاں
مرکزِ حسنِ نظر پیکرِ رنگیں ہوگا
اور احساس پہ چھائے گا مسرّت کا سماں

خوابِ غفلت سے اگر جاگ گیا اس کا شعور
کیا خبر اس کی نگاہوں کو نہ بھائے یہ سماج
یہ ہر اک گام پہ پہرے، یہ نگاہوں کے حصار
یہ روایاتِ فسردہ، یہ بُرے رسم و رواج

کیا خبر قوم کی اصلاح کی خاطر اِک دن
اپنے ماحول سے وہ برسرِ پیکار رہے
اندھ وشواس کے مارے ہوئے لوگوں کے لیے
اُس کے آدرش کی چلتی ہوئی تلوار رہے

اس کو جینا ہے بہرحال ابھی جینا ہے
اپنے ہر فرض کی تکمیل کی خاطر ہی سہی
اپنی گمنام امنگوں کی کہانی بن کر
اپنے ماحول کی تشکیل کی خاطر ہی سہی

مُردنی چھائی ہوئی ہے جو، مٹے وہ یکسر
اس کے چہرے پہ بھی صحت کا ہو رنگیں غازہ
موت اور زیست کی اس کشمکشِ پیہم میں
یہ دعا ہے کہ ملے اس کو ... تازہ

نغمہ ہائے وطن

KUTAB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

وفا کی راہ

پیا جو جامِ شہادت تو زندگی پائی
چڑھے جو دار پہ اعزاز کا پیام آیا
بہت کٹھن تھا سفر کا ہر اک قدم لیکن
وفا کی راہ سے گزرے تو یہ مقام آیا

جلے جو شمع کی مانند ملک کی خاطر
اندھیرا دور ہوا، روشنی نظر آئی
کئی برس کی غلامی کا طوق اُترا تو
فسردہ چہروں پہ کچھ زندگی نظر آئی

ہمیں نصیب ہے جو کچھ بہارِ آزادی
ہزار خونِ شہیداں کی اِک فضیلت ہے
جو سُرخرو ہیں زمانے میں آج بھی ہم لوگ
وطن پرست مجاہد ہی کی بدولت ہے

رکھو وہ جوشِ محبت کہ آج جس کے بغیر
یہ سرفروشی کی کچھ رسم ہی نہیں ہوتی
ہزار منزلیں آئیں بڑھے چلو آگے
وفا کی راہ کبھی ختم ہی نہیں ہوتی

خیر مقدم

اپنی ہر سانس ابھی درپئے آزار سہی
نگہِ شوق بہاروں کی طلبگار تو ہے

کون سا دور رہے جب ہم نے بہاروں کیلئے
اپنے ہر لمحہ کو وقفِ غم و حرماں نہ کیا
اپنی ناکام امنگوں کی جلا کر قندیل !
صحنِ گلشن کے اندھیروں میں چراغاں نہ کیا

کون سا دور ہے ایسا کہ لہو کی بوندیں
ہم نے رنگینئ ماحول پہ قربان نہ کیں
سرخئ خونِ شہیداں کی نمائش کے لیے
ہم نے کب وقت کے پیروں پہ جھکائی ہے جبیں

قافلے شوخ نظاروں کے رہے ہم سے پرے
اور ہم دور بہت دور بہاروں سے چلے
پھر بھی جب صحنِ گلستاں کی زیارت کی ہے
پھول تو پھول ہیں کانٹوں کو لگایا ہے گلے

ہم نے کلیوں کے دلآویز تبسم کا لباس
ان کی گمنام امنگوں سے اترنے نہ دیا
دستِ گلچیں کے غضبناک ارادے تھے مگر
ان کی عصمت پہ کوئی داغ بھی لگنے نہ دیا

پھر وہی دور ہے ایثار کا، قربانی کا
اس برس پھر ہمیں دینا ہے بہاروں کو خراج
اپنے ماضی کی روایات کا پیکر بن کر
پوچھنا ہے ہمیں رنگین نظاروں کا مزاج

JALALI BOOKS
JALALI

وطن کے نام پر

بدل گئی ہے بہت آج وقت کی رفتار
وطن کے نام پہ کرنا ہے جان و دل کو نثار

وطن نے اپنے جیالوں کو آج دی ہے پکار
حرام ہو گئیں نیندیں، اب عیش ہے بیکار
کوئی مثال نہ مل پائے وہ کریں ایثار
وطن کے نام پہ کرنا ہے جان و دل کو نثار

ہمارے عزم و شجاعت کی آزمائش ہے
ہماری طاقت و ہمّت کی آزمائش ہے
وطن سے آج محبّت کی آزمائش ہے
وطن کے نام پہ کرنا ہے جان و دل کو نثار

وطن کی خاک کے ذرّات ہیں عزیز ہمیں
وطن کے جنگل و باغات ہیں عزیز ہمیں
وطن کے نام پہ خطرات ہیں عزیز ہمیں
وطن کے نام پہ کرنا ہے جان و دل کو نثار

مثالِ آہنی دیوار ہیں ہمارے جواں
ملیں گے اور زمانے میں ان کے جیسے کہاں
ہمیشہ قول یہ رہتا ہے ان کے وردِ زباں
وطن کے نام پہ کرنا ہے جان و دل کو نثار

ہزار خونِ شہیداں کی اک فضیلت سے
ہوا تھا ملک یہ آزاد کس مصیبت سے
سبق ہمیں بھی یہ لینا ہے اِس حقیقت سے
وطن کے نام پہ کرنا ہے جان و دل کو نثار

ہمارے دم سے یوں پھولے پھلے وطن اپنا
کسی طرح بھی نہ پیچھے رہے وطن اپنا
اٹھو کہ پھر نہ شکایت کرے وطن اپنا
وطن کے نام پہ کرنا ہے جان و دل کو نثار

JALALI BOOKS
JALALI

ہم

زمانے بھر کی نگاہوں میں سرفراز ہیں ہم
سبھی یہ کہتے ہیں مخلص ہیں، غم نواز ہیں ہم

ہمیں نے آدمیت کے اُصول اپنائے
ہمیں نے درد کے رشتوں کا احترام کیا
زمانے بھر کو اخوت کا اک سبق دے کر
ہمیں نے امن کو ہر دور میں سلام کیا

ہمیں نے جادۂ الفت پہ گامزن ہو کر
خلوص و مہر و محبت کو تازگی بخشی
ہر ایک لمحہ گواہی یہ آج دیتا ہے
ہمیں نے وقت کی قدروں کو زندگی بخشی

اِدھر جو آندھیاں آئی ہیں آفتوں کی کبھی
ہتھیلیوں پہ لیے اپنی جان آئے ہیں
ہمیں نے شوق شہادت کا دل میں رکھا ہے
وطن کے واسطے ہم نے ہی سر کٹائے ہیں

ہمیں نے دل میں جگہ بے گھروں کو دیدی ہے
گلے سے ہم نے لگایا ہے غم کے ماروں کو
نگاہیں ہم نے بچھائی ہیں ان کی راہوں میں
دیا ہے ہم نے سہارا بھی بے سہاروں کو

سسکتے جسموں میں ڈالی ہے روحِ آزادی
گھسٹتے ڈھانچوں کو اِک عزم ہم نے بخشا ہے
بجھی بجھی سی تمنّا کو حوصلہ دے کر
گھٹی گھٹی سی فضاؤں کو ہم نے بخشا ہے

زمانے بھر میں سیاست کی دھوم ہے ایسی
ہر ایک لب پہ ہمارا ہی نام ہوتا ہے
ہماری سمت عقیدت سے آنکھ اٹھتی ہے
ہمارا ذکر بصد احترام ہوتا ہے

اگر روایتِ دوراں کو برقرار رکھا
تو ہم پہ کوئی بھی انگلی اٹھا نہیں سکتا
اسی روِش پہ جو چلتے رہے زمانے میں
ہمیں نظر سے کوئی بھی گرا نہیں سکتا

سلامت روی کا دور

شمعِ عمل کی بڑھتی ہوئی روشنی میں ہم
تعمیرِ عہدِ نو کے لئے گامزن رہے
دنیا نے لاکھ چاہا مٹانا ہمیں مگر
ہر منزلِ حیات پہ ہم خیمہ زن رہے

شرمندۂ وجود تھا صدیوں سے جو سفر
اک سال کے قلیل سے عرصہ میں طے کیا
دنیا کو بے مثال سیاست کا ہر ثبوت
اک رہنما کی پختہ قیادت میں دے دیا

اب آ چلا ہے امن و سلامت روی کا دور
اب ذہنی انتشار کا عالم نہیں رہا
ناکام حسرتوں کا بھلا ذکر کیا کریں
یہ انتہا ہے دِل میں کوئی غم نہیں رہا

نظمیں

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

پیش گوئی

رات آئی ہے تری زلف کی خوشبو کو لیے
ذہن جاگا ہے تری یاد کی دستک سُنکر
کلیاں چٹکی ہیں تبسّم کی ادا کے بدلے
پھول مہکے ہیں ترے حسن کا پیکر جیسے
غنچے لگتے ہیں کہ اب بول اٹھیں گے شاید
پھر بھی افسوں یہ رہے گا تو رہے گا کب تک
صبح آئے گی امیدوں پہ غضب ڈھائیگی
آج کی رات بھی شاید تو نہیں آئے گی

●●

KUTUB KHANA.

اُمنگ

گلرنگ چہرہ، چشم نگوں، لب پہ کنپکپی
رخسار پر رواں کوئی موج لطیف سی
دھڑکن بھی تیز، جسم میں کچھ ارتعاش بھی
سینے کے زیر و بم سے قیامت اٹھی ہوئی
اظہارِ مدعا ہیں سراپا وہ اِس گھڑی
اے دل سمجھ لے آج کوئی بات اَن کہی

●●

نام

میرے ہونٹوں پہ ترے نام کا معصوم چلن
ایک طوفان سا ذہنوں میں اٹھا دیتا ہے
ایک اک حرف سے بنتی ہے نئی بات کوئی
ہر کوئی بات کو افسانہ بنا دیتا ہے

جب بھی جھڑتے ہیں لبوں سے مرے دِلکش موتی
اس سے پہلے کہ گریں، لوگ انھیں چُن لیتے ہیں
میں ترا نام اگر دِل میں بھی دہراؤں تو
کیا خبر اُس کو بھی کس طرح سے سُن لیتے ہیں

میں ترے نام کے مطلب پہ اگر غور کروں
بوئے گل، بادِ سحر، نزہت و نکہت ٹھہرے
اور جب لوگ اسی نام کی تشریح کریں
ان کا مفہوم مری ذات سے نسبت ٹھہرے

بوئے گل ذہن کو گلزار بنا دیتی ہے
تازگی جسم کو کرتی ہے عطا بادِ سحر
کیفیت نزہت و نکہت کی ہے دل پر طاری
ہے ترے نام کی تاثیر بڑی کیف اثر

تجھ سے منسوب تمناؤں کی تکمیل کو میں
الجھا رہتا ہوں سدا گردشِ ایام کے ساتھ
زندہ رہنے کے لیے اور کشش ہی کیا ہے
اک تعلق کے سوا وہ بھی ترے نام کے ساتھ

۱۰

تلاش

ڈھونڈتی ہیں تری بے چین نگاہیں کس کو

اے محبت کے پرستار، وفا کی دیوی
تیرے نغموں کی صداؤں کا کوئی ساز تو ہے
اپنے سینے میں جسے تو نے چھپا رکھا ہے
اُس حسیں راز کا اپنا کوئی ہمراز تو ہے

نام پر کس کے ترے دل نے دھڑکنا سیکھا
کس کی امید پہ یہ سانس لیے جاتی ہے
کون چھایا ہے ترے ذہن پہ اتنا زیادہ
ہر گھڑی اس کی ہی تصویر نظر آتی ہے

بے وفا کون ہے وہ جس نے محبت کے عوض
تیری معصوم جوانی کو دیا ہے اِلزام
تیری امید کی کلیوں کو مسل ڈالا ہے
تیرے رنگین فسانے کو رکھا ہے ناکام

آج جو جھوٹی ہنسی غم کو چھپا لیتی ہے
کیا پتہ کل اُسے اشکوں میں بدلنا پڑ جائے
اور پھر وقت وہ آجائے کہ مجبوری میں
ہر حقیقت کو تجھے منہ سے اُگلنا پڑ جائے

آج بھی وقت ہے اتنا تو بتا دے مجھ کو
ڈھونڈتی ہیں تری بے چین نگاہیں کس کو

بے وَفا

بھول جانا کسی ساتھی کا نہیں ہے ممکن
اس کا احساس تجھے کاش ابھی ہو سکتا
اور ساتھی بھی ہو ایسا کہ جہاں میں شاید
آج تک کوئی ہوا ہے نہ کوئی ہو سکتا

تیرا اس طرح بدلنا یہ بتاتا ہے مجھے
بے وفا تجھ کو محبّت کا سلیقہ ہی نہیں
پیار کہتے ہیں کسے اور محبّت کیا ہے
تجھ کو آتا ہی نہیں، تو نے یہ سیکھا ہی نہیں

غور کر اس کو بھلانے کا ارادہ کیسا
جس کی ہر بات پہ تو جان دیا کرتی تھی
اور جب دھیرے سے وہ کان میں کچھ کہتا تھا
نیچی نظروں سے اُسے مان لیا کرتی تھی

بھول جائے گی وہ سائے جو سُہانی شب میں
ایک دوسرے کی طرف بڑھتے تھے خاموشی سے
اور پھر ایک ہی سایہ نظر آتا تھا وہاں
جس میں حرکت کبھی ہوتی تھی تو مدہوشی سے

مجھ سے وعدہ جو کئے تو نے بھلا کر اُن کو
چین مل جائے زمانے میں نہیں ہو سکتا
میں نے اقرارِ وفا تجھ سے کیا ہے ظالم
ذہن میرا تری آواز نہیں کھو سکتا

میری آواز کبھی گونجے گی تنہائی میں
اپنی بھولی ہوئی باتوں کو جگانے کے لئے
جل اٹھے گی کسی ناکام تمنّا کی طرح
یاد کے سرد چراغوں کو جلانے کے لئے
یاد بھر بیتے ہوئے وقت کی نشتر بن کر
تجھ کو ملتے ہوئے آرام کا خوں کر دے گی
وہ محبّت جو ترے دل میں دبی بیٹھی ہے
تیری ہر صبح کا ہر شام کا خوں کر دے گی

بھول جانا کسی ساتھی کا نہیں ہے ممکن
اس کا احساس تجھے کاش ابھی ہو سکتا

●●

شامِ ملاقات

آج کی شام ملاقات کا ارماں لے کر
کس قدر وقت سے گزرا ہوں گریزاں ہو کر
کیا ستم ہے کہ وہی شام چلی جاتی ہے
میری مایوس نگاہوں سے پشیماں ہو کر

میں نے چاہا تھا کہ ناکام اُمنگوں کی خلش
دب کے رہ جائے فسوں کاری قربت کے تلے
اور سو جائے مری وحشت و حسرت کا جہاں
اس قدر گہری کوئی نیند کہ کروٹ بھی نہ لے

یہ شفق زار فلک، خونِ تمنّا کا امیں
دل کی کیفیت مجروح کا عکّاس بھی ہے
دھیرے دھیرے یہ بدلتا ہوا منظر جس کو
ذہن میں بڑھتی ہوئی یاس کا کچھ پاس بھی ہے

حدِ آخر کی طرف بڑھتا ہوا دن کا جلوس
چند لمحوں کے لیے رُک سا گیا ہو جیسے
تو ابھی آئے گی اک نور کا پیکر بن کر
ڈھلتے سورج کی شعاؤں کو پتہ ہو جیسے

تو جو آجائے تو آنکھوں کی گرانبار تھکن
ایک ہی پل میں ملاقات کا نشہ بن جائے
منتظر شام کا ٹھہرا ہوا، بوجھل یہ سماں
کیف اور نور کا دریا بن جائے

●●

انتشار

یہ رات یونہی سمٹتی رہی تو کچھ پل میں
تھکے ہوئے کسی سورج کو جاگنا ہوگا
چلو کہ جائے اماں ڈھونڈ لیں کہیں جاکر
سحر سے پہلے ستاروں کو بھاگنا ہوگا

نہ جانے اور بڑھے گی زمیں میں کتنی کشش
کہ آسماں نظر آنے لگا ہے کوئی غبار
فضا میں پھیلی ہوئی دھند میں نہائے ہوئے
کروڑوں لوگ ہیں اپنی ہی سانس سے بیزار
لہو کی آگ میں جلتے ہوئے بدن کیلئے
کہیں بھی پیڑ کا سایہ نظر نہیں آتا
نظر پہ برق صفت روشنی کے پرتو سے
کسی کو ہاتھ بھی اپنا نظر نہیں آتا

پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں مکان کی مانند
زمین پھٹنے لگی گیلے کاغذوں کی طرح
سمندروں نے بنائے ہیں راستے ہر سو
ہوا میں شور ہے بھرپور بادلوں کی طرح

یہ انتشار کا عالم جو اور بڑھ جائے
نصیبِ وقت کو شاید ثبات مل جائے
بھٹکتے، جلتے، سسکتے ہوئے تقاضوں سے
حیاتِ کہنہ کو دائم نجات مل جائے

●●

پیکرِ خیال

تتلی کے رنگ، پھول کی خوشبو، ہوا کا لمس
اِن سے بھی دلفریب ہیں رعنائیاں تری

عارض تمام رنگ و ملاحت لیے ہوئے
لب تیرے بے مثال ہیں نرمی کے باب میں
زلفوں کا کیف رات کے دامن میں کچھ سہی
خوشبو ترے بدن کی کہاں ہے گلاب میں

تیرا خرام ناز بہاروں کا سلسلہ !
قدموں کی چاپ جیسے مرے دل کی دھڑکنیں
خوش رنگ پیرہن پہ کوئی گیت پیار کا
آنچل سے کھیلتی ہوئی معصوم اُلجھنیں

دلکش ادا کے ساتھ تبسم کی چاندنی
اکثر بکھیرتی ہوئی میری نگاہ تک
تو جیسے آگئی ہو بصد شانِ احتیاط
دل کی حسین، سمٹی ہوئی جلوہ گاہ تک

اے جانِ آرزو مرے خوابوں کی دِلکشی
میں سوچتا ہوں تجھ سے تعلق کو کیا کہوں
بے راہ روئی شوق کہ معراج عشق کی

●●

سرابوں کا سفر

سوچی ہوئی تقدیر سے وابستہ خموشی
جیسے مرے اعصاب پہ خوش رنگ قبا ہو

تتلی کے پروں کی طرح نازک سی امنگیں
کھلتے ہوئے پھولوں کا پتہ پوچھ رہی ہیں
ٹھہرے ہوئے پانی پہ بکھرتی ہوئی لہریں
ساحل کی تمنا میں کئی بار اٹھی ہیں

منزل کا پتہ دیتے ہوئے میل کے پتھر
اب گرم نگاہوں سے پگھلتے بھی نہیں ہیں
وہ راستے جن پر کبھی اک شور بپا تھا
آواز سے قدموں کی تھرکتے بھی نہیں ہیں

پیڑوں سے ابھرتی ہوئی کونپل کا ہراپن
رنگینی بکھیرے مرے آنگن میں کہاں تک
پھیلی ہوئی خاموش سیاہی سے گزر کر
تاروں کا سفر رات کے دامن میں کہاں تک

چاہت کے ارادے، تری قربت کا تصوّر
بیتا ہوا ہر پل مرے خوابوں کا سفر ہے
میں دور بہت دور چلا آیا ہوں، لیکن
خاموش تمنّا تو سرابوں کا سفر ہے

میں دیکھ رہا ہوں کہ تری مانگ سمٹ کر
اک نقطۂ موہوم بنی جاتی ہے پھر بھی
سوچی ہوئی تقدیر سے وابستہ خموشی
جیسے مرے اعصاب پہ خوش رنگ قبا ہو

JALALI BOOKS
JALALI

اکائی

تخاطب کا مرکز
زگ وپے کی یورش
سمندر سے دشت وجبل کا سفر ہے
خوشی اور غم کی
نگہباں خموشی
کسی زاویے پر
خط استوا سے گریزاں نہیں ہے

ازل اور ابد
یونہی اک دوسرے سے
جدا ہم نے دیکھے،
جدا ہی رہیں گے
اکائی سفر ہے، اکائی خموشی
اکائی میں ہم سب سمائے ہوئے ہیں

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

روشنی تو ہونے دو

روشنی کی سرکردہ
سرخیاں کہاں تک ہیں
رات سے کبھی پوچھو
کس لیے
اُمنگوں کی
بات کر نہیں سکتے
پیرہن سے عاری ہیں
جسم
روشنی کی خواہش میں
آؤ
ہم کوئی سورج
یا دہکتا انگارہ
آسماں سے لے آئیں
سرخیوں سے گھر بھر لیں
پیرہن بھی ڈھونڈیں گے
روشنی تو ہونے دو۔

نارسائی

کبھی التجا
زندگی بن گئی تھی
مگر راستے
سختیوں کے گھنے جنگلوں میں گئے
چمکتی ہوئی
گرم کالی سڑک
اُفق میں سمانے لگی دفعتاً
پرندوں نے
پنجوں پہ رکھ دی زباں
الاماں، الاماں
خامشی درمیاں
یہی تو نہیں ہے وہ وقتِ دعا
کہ دروازے سب بند ہو جائیں گے
کہاں آ گئے ہم، کہاں جائیں گے

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

تم

مرے لبوں سے
تمام وحشت
پھسل گئی ہے
تناؤ
سارا ہی مٹ گیا ہے
خموشیوں میں جو بیکراں تھا
وہ ایک جذبہ
زباں پہ آکر
بس ایک "تم" بن کے رہ گیا ہے

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

تجدید

آسائشِ حیات کے سامان
جا بہ جا
تکمیلِ کائنات کا ہر ولولہ
جواں
زر بافت پیرہن پہ چمک
جسم میں گداز
سب کچھ نیا نیا سا مگر قابلِ قبول
اب ہے صعوبتوں کی طرف دیکھنا فضول

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

سراب

سب ریزہ ریزہ خواب ہیں
پیوست جان و دل
سایہ جسے تلاش کرے
وہ بدن نہیں
کانوں میں رَس گھُلا ہے
کسی خوش الحان کا
بندِ قبا کھلے ہیں
مگر ہاتھ دور ہیں
آواز آ رہی ہے کہیں دور سے کوئی
میں کاروانِ وقت کا
رہبر بنا ہوا
اپنی ہی سمت دوڑ رہا ہوں
مگر شمیمؔ !
تھی کیسی برق
جس کے تعاقب میں دور تک
آیا ہوں
اور خود سے بھی انجان ہو گیا

پڑاؤ

ٹھہرے ہوئے ہیں قافلے
لیکن رواں دواں حیات
سو جشنِ آب و تاب ہے برپا کیے ہوئے
رقص و سرور
چہلیں
تکلف، صیافتیں
جو راہ میں شروع ہوئی تکرار
اس کا جوش
خنجر کو بے نیام کرے
اور جسم کو نیام
منزل پہ جا پہنچنے کا پُرعزم ولولہ
رختِ سفر کو رات سے پہلے ہی
باندھ لے
کب آخری پہر ہو کہ
پھر کوچ کر سکیں

قانون کی موت

وہ ایک عہدِ صلیب و زنداں
کہ دسترس میں تھے جس کی
ہم تم
اصول جس کے تھے حرف محکم
مزاج جس کا تھا جابرانہ
سماج نالاں تھا
لوگ خائف
وہ جس کا چہرہ گھناؤنا تھا
سنا ہے آئی ہے موت اُس کو
دکھائی دیتے ہیں آج کل تو
کفن پہ اُس کے یتیم آنسو
سہاگنوں کے لہو کے چھینٹے
بزرگ آہوں کی تیز میخیں
اور ایک تابوت خودکشی کا

ٹائم مشین

یہ حقیقت ہے کہ ہم ہیں مگر اک دن یہ بھی
وقت کے اندھے سفر میں کہیں گم ہو جائے گی
اور پھر تازہ حقیقت نظر آئے گی یہاں
زندگی جس کے لئے
سر بہ کفن ، گریہ کناں
اپنے ہونے کی نفی کرتی ہوئی
پھر اُسی اندھے کنویں میں کہیں گم ہو جائے گی
سلسلہ روزِ ازل سے یہاں جاری ہے یہی

آؤ ہم اپنے لئے
اپنی اجل سے پہلے
اک روش ایسی بھی ایجاد کریں
وقت کا اندھا کنواں ہم ہی میں مدغم ہو جائے

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

تمہارے حسن کے چرچے میں اور ہو شدّت
مرا یہ عشق زمانے پہ بار ہو جائے
اگر روایت ماضی سے ہٹ کے تم کو بھی
مرے وجود سے تھوڑا سا پیار ہو جائے

شام سے انتظار رہتا ہے
دل مرا بے قرار رہتا ہے
تم نے وعدہ کیا تھا بھول گئے
یاں وہی اعتبار رہتا ہے

زلف اک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا سایہ
غم و الآم و مصائب سے بچائے رکھے
پھر بھی اِس دورِ خرد میں یہ کہاں ممکن ہے
آدمی اپنی ہی سُولی کو اٹھائے رکھے

صیدِ زلفِ دراز بن جاؤں
تیرے گیتوں کا ساز بن جاؤں
تو جو دل میں جگہ مجھے دے دے
تیری آنکھوں کا راز بن جاؤں

تیری نظریں ہیں اجالے کی درخشاں کرنیں
تیری آنکھوں میں سحر ڈول رہی ہو جیسے
ان کو دیکھوں تو کئی راز سمجھ لیتا ہوں
تیری ہر ایک پلک بول رہی ہو جیسے

تیرے ہونٹوں کی سلوٹوں پہ اگر
میری سانسوں کی آبشار گرے
جاگتے ذہن کی فضاؤں پر
بے خودی کی حسیں پھوار گرے

میں نے دھیرے سے ترا نام لیا ہے جب بھی
ذہن میں پھول کھلے، لب پہ ترنم جاگا
جب تری یاد نے کھولے ہیں مہکتے گیسو
آنکھ مدہوش ہوئی، لب پہ تبسم جاگا

آرزو ہے مسرتوں کی اگر
غم کو مرہونِ التفات کرو
زندگی بڑھ کے چوم لے گی قدم
موت سے مسکرا کے بات کرو

میں تو تصویر کے چہروں پہ نظر رکھتا ہوں
جن میں جذبات کا ٹھہراؤ ہے، سیلاب نہیں
صرف ماضی کے شب و روز کی رعنائی ہے
میری ان جاگتی آنکھوں میں کوئی خواب نہیں

نہ جانے درد کی منزل ہے یا کوئی غم ہے
ترے خلوص کی پہچان بن گیا ہوں میں
میری رگوں سے نچوڑا گیا ہے جب بھی لہو
خود اپنے آپ سے انجان بن گیا ہوں میں

خلش رہی کہ تری آرزو میں جی کر بھی
ہم اپنی ذات کو تجھ پر نثار کر نہ سکے
تمام عمر گزاری تو اس قدر سمجھے
ہزار بار مٹے، ایک بار مر نہ سکے

تمہاری زلف کے سائے میں نیند آتی ہے
تمہاری آنکھ کا جادو ہمیں جگاتا ہے
وہ اور ہیں جو بہکتے ہیں ایسے لمحوں میں
تمہارے ہاتھ سے پی کر تو ہوش آتا ہے

تجھ سے ملنے کی آرزو لے کر
زندگی یوں گزار لیتے ہیں
جیسے مایوسیوں سے اکتا کر
چند خوشیاں ادھار لیتے ہیں

••

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

ڈاکٹر سخاوت شمیم

نام: سخاوت علی بیگ

تاریخ پیدائش: ۸ر جون ۱۹۵۱ء

جائے پیدائش: ٹونک (راجستھان)

ولدیت: جناب مبارک علی بیگ دل ایوبی

تعلیم: ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ۱۹۷۳ء

ایم۔ ایس (جنرل سرجری) ۱۹۷۸ء

محلِ کار: سرجن ڈی۔ بی اسپتال

چورو (راجستھان)

رابطہ: 38/A امرت پوری نگھاٹ گیٹ

جے پور۔ 302003

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS